کنارہ دشتِ تمنا کا از آسیہ مرزا

السلام علیکم

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842

کنارہ تمنا فراق کا

از

آسیہ مرزا

www.novelsclubb.com

کنارہ دشتِ تمنا از آسیہ مرزا

مکمل ناول

آسیہ مرزا

کنارہ دشتِ تمنا

digest novels lovers group ❤️❤️

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر انہیں بالوں سے کیا تکلیف پہنچی تھی، جو اتنا بڑا ظلم ڈھا گئیں؟"

"سوشل ورکر ہونے کے لیے پہلے بالوں پر قینچی چلانی ضروری ہے کزن؟"

"تو کیا بہت چھوٹے کرا لیے ہیں؟" روشانہ کی آنکھیں اُبلنے کو تھیں۔

"دو دو انچ کے بال پرم کر کے ایک انچ کے کر دیے ہیں۔ کھال تک دکھائی دینے لگی ہے، ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا، برسوں کی میلی گردن پر اس دن خوب فیشل ہو رہا تھا کیوں پلوشہ! ہم گئے تو اسی کی جھاڑ پونچھ ہو رہی تھی ناں!"

آمنہ یہ ساری باتیں بڑی سنجیدگی سے بتا رہی تھی۔ پتا نہیں اسے ہنسی کیوں نہیں آ رہی تھی۔

"میں نے کہا اُسترا ہی پھروا دیتیں۔ انچ دو انچ کے بالوں کی اس رنج رنج سے بھی جان چھوٹ جاتی، پھر تو صرف مالش ہی رہ جاتی کرنے کو۔"

"ہائیں تم نے خالہ جی سے یہ کہہ دیا؟" روشانہ نے منہ پھاڑے میری طرف دیکھنے لگی۔ جبکہ مہرو اور رابعہ رکمی کبھی میں مصروف تھیں۔

"نہیں خیر، ان سے تو نہیں کہا۔ بس یونہی دل میں سوچا۔ ان کے ہاتھ میں راڈ تھی، جو خوب گرم تھی۔ مجھے پھینک ہی دیتیں۔"

روشانہ کی اٹکی ہوئی سانس جیسے بحال ہوئی۔

"یوں بھی گرم گرم راڈ سر پر پھیرتے رہنے سے

ان کے اندر تک گرمی اتر گئی ہے۔ کہنا بھی مت کبھی۔" آمنہ نے مفید مشورے سے نوازا۔

"کل ان کا حقوقِ نسواں سیمینار ہے، چلو گی؟ ابھی ہفتہ دو ہفتہ ہوئے ہیں انہیں کوئی مسز معین کے گروپ میں شامل ہوتے۔ دیکھیں تو صرف بالوں کی کٹائی ہی ہوئی ہے یا کچھ کر بھی سکتی ہیں۔"

ہم سب ہی جھٹ پٹ راضی ہو گئے۔ بھلا پھپھو کی اکلوتی آزاد خیال (اور اب تو فارغ البال) سلطانہ جاہ عرف طبینی آپو کو تقریر جھاڑتے کیوں نہ دیکھنے جائیں گے۔ ہم زور جائیں گے بھی۔ کوئی مائی کا لال روک سکتا ہے۔ خیر وہ تو دوسرے دن پتا چلا کہ مائی کا لال یعنی

سبز خان نے وحشت ناک نگاہوں سے ہم سب کو گھورتے ہوئے پورچ میں گھیر لیا ہے۔ ہم سب چہلیں کرتے کرتے یکدم بغلیں جھانکنے لگے۔ میری تو جان ہی ہوا ہو گئی۔

"کہاں جانے کی تیاری ہے؟" ان کا سیدھا حملہ مجھ پر ہوا کہ شاید اس لیے کہ آگے کی رو میں، میں ہی لیڈری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

"وہ طبینی۔۔!" میرے منہ سے ابھی اتنا ہی نکلا تھا کہ آمنہ نے اپنا من بھر وزنی پیر کا سارا وزن میرے نازک پیر پر رکھ دیا۔

"مہرو کی برتھ ڈے ہے نا کل، تو ہم نے سوچا کہ اس کے لیے گفٹ لے آئیں۔" چالاکو منی نے بات بنالی۔ جبکہ وہ کچھ دیر مشکوک نظروں سے ہم سب کو گھورتے رہے۔ ان سبز ہیروں میں خفگی ہنوز قائم تھی۔ پھر یونہی ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر ہنکارا بھر کر بولے۔

"ایمان کو لے جاؤ ساتھ۔"

"وہ بے ایمان۔ میرا مطلب ہے وہ ایمان دار۔ منع کر رہا ہے۔" ٹکا سا جواب دے دیا اس نے۔" دوسرا جھوٹ میں نے بولا تھا۔ محض طبینی آپو کو ایک سوشل ورکر کے روپ میں دیکھنے کی خاطر۔

"ہوں۔ زمان علی!" انہوں نے اونگھتے ڈرائیور کو پکارا۔ "بچیوں کو لے جاؤ شاپنگ پر۔ خیال رکھنا جہاں رش کم ہو وہیں اتارنا انہیں۔"

انہوں نے آخری فرض ادا کیا اور چلتے بنے، ہم نے شکر کا سانس لیا کہ جان خلاصی ہوئی۔ ورنہ سبز بڑ لالہ کے گھیرے سے نکلنا کوئی آسان بات نہیں۔

"آہ کاش! ہم بھی پھپھو کی اولاد ہوتے؟" مجھے اپو کی آزادی پر رشک آنے لگا۔

"اونہہ! کتنی کہ ایک تو اولاد ہے، اس لیے ناز اٹھائے جاتے ہیں۔ ہماری طرح بہبود آبادی کا تیا پانچا کرنے والے پانچ پانچ چھ چھ بہن بھائی نہیں ہیں۔" آمنہ کو اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں سے سخت چڑ تھی۔ جہاں جاتی، پیچھے بھاگے آتے، اور وہ ایسا جھا پیڑ دافتی کرود بے چارے جہاں کھڑے ہوتے وہیں زمین بوس ہو جاتے۔

"اوئے چل مہرو! تیری برتھ ڈے کا گفٹ لے آئیں۔" رالعہ مہر کو دیکھ کر ہنسی۔ تو وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی اٹھلانے لگی۔

"اب تو تمہیں زبردستی میری برتھ ڈے سیلیبریٹ بھی کرنا ہو گی، اور گفٹ بھی دینے ہوں گے، ورنہ میں سبز بڑ لالہ سے تمہارے جھوٹ کا پول کھول دوں گی۔" وہ زیادہ ہی اکڑ گئی۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"گفٹ تو میں تمہیں وہ دوں گی کہ تمہارے اچھے بھی یاد کریں گے۔ دیکھو تو ذرا اتنی سی جان پر کیسے اکڑ رہی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا معاف کرو مجھے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔" وہ آمنہ کو اپنی چپل کی طرف ہاتھ بڑھاتا دیکھ کر چلائی۔ تب روشانے نے ہمیں گاڑی میں موجود ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلایا، اور ساتھ یہ بھی ڈرایا کہ جلدی نکل چلو، اس سے پہلے کہ کوئی اور مائی کا لال ہمارا راستہ روکنے آ کھڑا ہو۔

یوں بھی ہمارے خاندان کے سارے لڑکوں اور ان میں وہ تین تین نیلے بھی شامل تھے جن کی مونچھیں بھی ابھی ظاہر ہوئی تھیں خوامخواہ میں ہیرو بننے کے خبط میں مبتلا تھے۔ اور ان کے خیال میں ہیرو صرف لڑکیوں پر رعب ڈالنے سے ہی بنا جا سکتا تھا۔ ویسے ہم نے بھی ابھی تک ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ال بہت بڑا نہیں تھا۔ مگر جتنی گنجائش تھی اس
مہمان خواتین با آسانی سما چکی تھیں۔
ہم پانچوں کو دیکھ کر طیبی آپو کا منہ کچھ دیر کھلا کا
کھلا رہ گیا۔ جبکہ ہمارا انہیں دیکھ کر۔
بالوں کی کٹائی نے ان کی لمبی گردن کو نمایاں کر
دیا تھا۔ اور اس نمایاں گردن میں ہیرے کا جگمگاتا
نمایاں تھا۔ بڑے بڑے آویزے، سرخ کڑھائی
والی شرٹ اور تنگ پاجامہ، چھوٹا سا دوپٹہ
ان کے قیامت خیز سراپے کو چھپانے سے قاصر
تھا۔ یوں بھی وہاں ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی جا رہی
تھی۔ سینڈل کی ہیل نوک دار اور اونٹ کی گردن
جیسی لمبی تھی۔

انہیں دیکھ کر روشانے، مہرو اور رابعہ تو بے چاری
سکتے میں آگئی تھیں۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا
کہ جلال الدین خان کی نواسی دیسی ڈیانا کے روپ
میں بھی کبھی نظر آئے گی۔

"آہ —! ویری، ویری سرپرائزنگ۔"
انہوں نے شیڈز سے سجی آنکھوں کو پٹپٹا کر
انہیں خوشگوار حیرت سے دیکھا۔
"ریلی! مجھے تو بے حد خوشی ہو رہی ہے، تم لوگوں
کو یہاں دیکھ کر۔ اجازت کیسے مل گئی؟" ان کے لہجے
میں حیرت کچھ غلط نہیں تھی۔
"ارے اجازت کہاں آپو! وہ تو سبز باغ لالہ کو
دکھا دے کر آئے ہیں، شاپنگ کا بہانا بنا کر۔"
میں نے حقیقت بتائی تو ان کا منہ یوں بن گیا جیسے
کسی نے زبردستی کڑوی دوائی ہو، اور ان کے حلق میں
پھنس گئی ہو۔
"یہ شخص پتا نہیں کیوں جلال الدین خان کا جانشین
بننے کی کوشش کرتا ہے۔ مائی فٹ۔" انہوں نے
نخوت سے سر جھٹکا۔
"یہ عورت کی آزادی کا زمانہ ہے۔ نانا جان کی
جوانی کا زمانہ نہیں ہے۔ ہم پیچھے والوں کے اقوال،
ان کی روایتوں اور نصیحتوں کو تھامے رہیں گے تو
آگے کیسے بڑھیں گے، ترقی کیسے کریں گے۔ میں تو اب
کہتی ہوں کہ تم لڑکیوں کو جلال ہاؤس میں اب
آواز بلند کرنی چاہیے۔ یہ منٹ منٹ پر اجازت

لے کر گھر سے نکلنا، یہ گھٹ گھٹ کر جینا۔ اگر تم لوگوں
کی جگہ میں ہوتی ناں، تو ڈائوٹ خودکشی کر لیتی —
تھینکس گاڈ کہ میرے والدین — خاص کر پاپا بہت
کھلی سوچ رکھتے ہیں۔"
میری اک فلاسفی بات پر آپو نے ٹھیک ٹھاک
لیکچر کھڑے کھڑے دے دیا۔ ہم ان کے احترام میں
کچھ بول بھی نہ سکے، سوائے ہوں ہاں کہنے کے۔ یہ تو اچھا
ہوا کہ کوئی انہیں آواز دیتا ہوا بلانے آ گیا۔ ورنہ تو وہ
ہم میں سے ایک آدھ کو باغی کر کے دم لیتیں۔
"خوامخواہ آ گئے یہاں۔" روشانے ہم میں سب
سے زیادہ پردہ کی پابند تھی۔ بزرگوں کی روایتوں
پر جان دیتی تھی۔ اور حد سے زیادہ فرمانبردار تھی۔ اس
لیکچر نے اس کا موڈ غارت کر دیا تھا۔
"اسے ترقی کہتے ہیں کہ عورت چادر اتار دے، باغی
ہو جائے، احترام بھول جائے، خوامخواہ مخلوط پارٹیوں
میں قہقہے لگائے — تو کیا ملک ترقی کر جائے گا۔ اگر
ایسا ہے تو انسان تو بہت پہلے ترقی کر لیتا، جب وہ
کپڑوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھا۔ جب رشتے ناتوں
کا احترام نہیں تھا، جب ہر شخص اپنی مرضی کا مالک تھا۔
زہر لگتی ہیں مجھے یہ سلطانہ آپو اپنے ان ہی نظریات
کی بدولت۔"
کرسیاں سنبھالنے کے بعد بھی روشانے کڑھتی
رہی۔
"چھوڑو بھی، تمہیں کس نے کہا ہے، ان کی باتوں
پر کان دھرو۔" ہم نے ان کا مذاق اڑایا۔ مگر وہ
سنجیدہ ہی رہی۔
"ہم نہ سہی کوئی تو دھرتا ہوگا۔ کتنی لڑکیاں کچے
ذہنوں کی ہوتی ہیں۔ کیا وہ باغی نہیں ہو جائیں گی؟" وہ
ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تلخ اور سنجیدہ ہو گئی
تھی، جبکہ طیبی آپو کی ایسی باتیں تو ہم اکثر و بیشتر سنتے
ہی رہتے تھے۔ اور دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔
"میرا خیال ہے، تمہیں اپنے ساتھ لا کر ہم نے بڑی
غلطی کی ہے۔" آمنہ اس کے چپ نہ ہونے پر دانت کچکچا
کر بولی۔
"میرا خیال ہے۔ میں نے یہاں آ کر حماقت کا ثبوت

دیا ہے۔ مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"ارے، ارے یہ تو تم دونوں باقاعدہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے" رالعہ گھبرا کر درمیان میں کود گئی۔

"تو مزید حماقت کا ثبوت دینے کے بجائے واپس چلی جاؤ، یہی تمہارے حق میں اچھا ہوگا، کیونکہ ابھی ملینی الیوڈا اس پہ آ کر مزید اسی قسم کی تقریر جھاڑیں گی، اور تم کان بند نہیں کر سکتی ہو۔"

"بہنی! تم تو عقل کے ناخن لو۔" مہرو نے اُسے جھڑکا۔ روشانے تو مارے غصے کے کھڑی ہو گئی تھی۔ بمشکل میں نے اسے سیٹ پر دوبارہ بٹھایا۔

"یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ جو حق بات اور سچ بات کرتا ہے اس کی سنی نہیں جاتی۔"

یہ فلسفہ کسی نے پچھلی رو سے جھاڑا تھا۔ ہم پانچوں نے بیک وقت چونک کر اپنی گردنیں موڑیں۔ وہ عین روشانے کی کرسی کے پیچھے بیٹھا تھا دس آنکھوں کو اپنے چہرے پر مرکوز دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"سچائی کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا۔ آپ بہت اچھا بول رہی تھیں، پلیز بولتی رہیے۔" وہ اچانک ہم سب کو نظر انداز کر کے روشانے کی طرف دیکھنے لگا تو روشانے دم سادھے رہ گئی۔

ایک اجنبی وہ بھی پورا کا پورا تو انا مرد۔ کس دھڑلے سے اس سے مخاطب تھا نہ صرف مخاطب بلکہ بے تکلف اصرار بھی۔ اس کا سفید چہرا لال ہو گیا۔

"آپ کون ہیں مسٹر! اور یہ خالص زنانہ محفل میں کیسے آ گئے؟" میری تیوریاں چڑھ گئیں۔ جو خطرے کی نشانی ہوا کرتی تھیں۔ آمنہ کا چہرا بھی رنگ بدلنے لگا۔ جبکہ روشانے دبک کر بیٹھ گئی تھی۔

"آیا نہیں ہوں، بلایا گیا ہوں۔ مجھے بلال احمد کہتے ہیں۔ ایک ایمان دار صحافی ہوں، اور کیسے آیا، تو اس سیمینار کی رپورٹ تیار کرنے پر مجبور ہوں۔ مگر آج پہلی بار اتنی اچھی اور خوبصورت باتیں کانوں میں پڑی ہیں کہ دل خوش ہو گیا۔ بلکہ باغ باغ، چمن چمن ہو گیا۔ یقین کریں ان کے خیالات تو بالکل میرے خیالات سے ملتے ہیں۔" اس کی چمک دار آنکھوں میں بڑی دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

جبکہ روشانے موتی ——— کی طرح اپنی چادر کے سیپ میں مزید سمٹ گئی۔ پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا۔

"دیکھیے مسٹر! زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے باقاعدہ آستینیں چڑھا لیں۔ "کوئی میری نازک سی عم زاد روشانے کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے میں اس کا منہ توڑ کر رکھ دیا کرتی ہوں۔"

"مگر محترمہ! میں نے ٹیڑھی آنکھ کا تو قطعی استعمال نہیں کیا۔ میں نے انہیں باقاعدہ سیدھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

وہ کوے کی نسل کا لگ رہا تھا۔ اس کی اس ڈھٹائی نے ہم سب کے مشترکہ جذبہ یعنی غصہ کو بھڑکا دیا۔ سوائے روشانے کے، جو کسی چوزے کی طرح میرے بازو میں دبک گئی تھی۔

"چھوڑو بہنی! اس کے منہ مت لگو۔" وہ آمنہ کا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بڑبڑائی۔ اور ہم سب نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ اس ڈھیٹ کے منہ نہ لگا جائے۔ مہر کے بقول سب بلاوجہ ہمیں متوجہ ہو جائیں گے۔

"یوں تو میں اتنی جلدی معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، مگر خیر چھوڑے دے رہی ہوں۔" میں نے رعب ڈال کر ہی بات ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ ہنس پڑا۔ تاہم بولا کچھ نہیں۔ پھر اُسے کسی نے دور سے پکارا تھا، وہ اپنا کیمرہ سیٹ کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر خبیث نے اٹھتے اٹھتے بھرپور نظروں سے روشانے کو دیکھا تھا۔

بہرحال اس کے کھسکنے پر ہم نے سکون کا سانس لیا، مگر رالعہ نے یہ مژدہ سنایا کہ ہماری نئی نویلی سوشل ورکر ملینی الیو خطاب جھاڑ کر جا چکی ہیں۔ اب ایک طرف کرسی پر بیٹھی ٹشو سے چہرا خشک کر رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی تالیاں بجتے بجتے تھم چکی تھیں۔

ہم سب کو شدید افسوس ہوا۔ اس لڑائی میں ہم اپنی تفریح غارت کر چکے تھے۔

"کیا کہہ رہی تھیں الیوٹ" میں نے انتہائی رنجیدگی سے پوچھا۔

"تمنا کہاں میں نے بھی اس الو کی وجہ سے۔" آمنہ اسٹیج کے پاس کھڑے اپنے کیمرے میں منہ دیے اس

کو دیکھ کر کچکچا کر بولی۔ یوں جیسے وہی دانتوں میں آگیا ہو۔

"دفع کرو، ایسا کون سا عمدہ بولتا تھا، نہیں۔ وہی آزادیٔ نسواں کا نعرہ۔ وہی باغیانہ خیالات، فضول لیکچر" روشانے نے سر جھٹکا۔ اسے خاص افسوس، بلکہ عام سا افسوس بھی نہیں ہوا تھا۔

"تمہارے اسی کھٹملوکی وجہ سے تو مِس ہو گیا ہے۔" میں نے اُسے گھورا تو وہ اچھل پڑی۔

"کیا آ ۔ کیا بکا تم نے۔ میرے۔"

"تو ادھر دیکھو۔ وہ تمہیں ہی دیکھ رہا ہے۔" مہرو نے کھی کھی کرتے ہوئے روشانے کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس کے ساتھ ہم بھی گھومے، مگر وہ شرمندہ ہونے کے بجائے 'ہلو' کرنے کے انداز میں آنکھوں کو جنبش دے کر مسکرانے لگا۔ اور روشانے ہائے اللہ کہہ کر میرے بازو میں دبک گئی۔ اب کے وہ بُری طرح نروس تھی۔ میں نے اسے پرے دھکیلا۔

"میں تمہاری مرغی اماں نہیں ہوں، پیچھے ہٹو۔" میں کھڑی ہو گئی۔ میرے ارادے کچھ اچھے نہیں تھے۔ آمنہ بھی اٹھی۔ اور ہم دونوں اپنی رو سے نکل کر داخلی دروازے کی طرف بڑھے، جہاں وہ ——— آخری مسکراہٹ اچھال کر۔ گیا تھا۔ اور کسی سے محوِ کلام ہو گیا تھا۔

رابعہ، مہرو اور روشانے بھی ہمارے پیچھے لپکیں۔

"کیا کرنے جا رہی ہو تم لوگ۔ چلو پلیز۔ ہم واپس چلتے ہیں۔" روشانے نے لپک کر میرا بازو دبوچ لیا۔ لڑائی جھگڑوں سے تو اُس کی جان جاتی تھی۔

"جائیں گے مگر اسے ذرا سبق سکھا کر۔" میں نے اس کی کانپتی انگلیوں سے بازو چھڑا لیا۔

"ایسے نہیں وشی!" وہ گھگھیائی۔

"مجھے بہت افسوس ہوا لیڈیز کہ آپ کی کزن کا لیکچر، میرا مطلب ہے اُن کی تقریر مِس ہو گئی آپ سے۔" وہ پلٹا۔ از حد احترام سے ہم سب سے مخاطب ہوا۔ گویا وہ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر یونہی انجان بنا ہوا تھا۔

"فکر مت کریں۔ کل کے میگزین میں سوشل راؤنڈ اَپ کے صفحے پر ان کی تقریر پڑھ لیجیے گا۔ میرا تو بہت دل چاہ رہا تھا کہ اُن کی تقریر کے نیچے آپ کے وہ خوبصورت الفاظ بھی قلم بند کر دوں۔" وہ بولتے بولتے روشانے کی طرف گھوم گیا، اور ادھر وہ ہائے اللہ کہہ کر میرے پیچھے ہو گئی۔

"دیکھیے مسٹر! آپ کا ہم بہت لحاظ کر چکے ہیں۔ حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی بھی۔" آمنہ دھاڑی۔

"کسی کی تعریف کرنا آپ کے نزدیک ڈھٹائی ہے؟" اس کی دھاڑ سے قطعی متاثر نظر نہ آ رہا تھا۔

"کسی غیر لڑکی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانے کو تو ڈھٹائی کہتے ہیں۔" میں مقابل ہوئی۔

"دیکھیے لیڈیز! میں عورتوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ میری باتوں کو بہت غلط رنگ میں لے رہی ہیں۔ جبکہ۔"

"جب کہ آپ کب سے شرافت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔" میں مزید کچھ بولتی کہ روشانے اور مہرو ہمیں کھینچ کھانچ کر دور لے گئیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تم دونوں کا، اتنے بڑے کیڈے مرد سے پنگا لے رہی ہو۔" مہر نے ہمیں گھورا۔

"میں اس کا منہ توڑ دیتی۔" آمنہ داخلی دروازے پر رُک کر بیٹھی۔ اس پر ایک گھورتا ہوا تنقیدی ڈالی۔ جو انگلیاں ہلا کر بائے بائے کر رہا تھا۔

"کس قدر ذلیل انسان ہے، اور یہ تم چوزوں کی طرح کیا بات بات پر سہم جاتی ہو۔ اٹھاتیں جوتی اور بجا دیتیں اس کے سر پر۔" میں نے اپنا سارا غصہ روشانے پر نکالا۔

"اچھا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے دوستوں کو جمع کر کے ہمیں بھون ڈالتا۔ کچھ نہیں تو کیمرہ ہاتھ میں تھا کھٹا کھٹ تصویریں لے کر کل کے اخبار میں کسی بُری خبر کے ساتھ لگا دیتا پھر۔"

"اوہ!" ہم سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ روشانے کا دماغ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔

"اب یہ اوقات رہ گئی ہے ہماری کہ ایک صحافی سے ڈرتے پھریں۔" مجھے تو سچ مچ روشانے کی عقل پر رونا آگیا۔

"اب زیادہ بڑکیں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے ساتھ تو ڈرائیور بھی منحنی سا ہے، اور پھر زیادہ گڑبڑ ہو گئی تو سبز پرلالہ کا سامنا کون کرے گا!"
مہرو نے سبز پرلالہ کی یاد دلائی، جنہیں ایک گھنٹے کا کہہ کر نکلے تھے اور اب دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ہم سب اس ڈھیٹ جرنلسٹ کو بھول کر واپسی کے لیے بھاگے۔

؎ یہ شانِ بے نیازی! یہ بے خودی کا عالم!
بے بات ہو گیا ہے، ان کا مزاج برہم!
اک پل میں ہم نے دیکھے کیا کیا حسین نظارے
کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے

میں نے گنگناتے ہوئے عمو جان کے کمرے کا پردہ اٹھایا ہی تھا کہ پہلی نظر انتہائی قریب کھڑے سبز پرلالہ سے ٹکرائی۔ بس دھماکا نہ ہوا۔ اس لیے کہ ان کے ہاتھ میں کوئی خطرناک چیز نہ تھی، ورنہ میرا سر ٹوٹتا اور ضرور ٹوٹتا۔

"بے ہودگی کی بھی حد ہوتی ہے۔" انہوں نے انتہائی غصّے کے عالم میں مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور باہر نکل گئے۔
اب مجھے کیا پتا تھا کہ عمو جان کے پاس سے انتہائی بُرے موڈ کے ساتھ اٹھے تھے، اور دوسرے مجھ سے تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تیسرے میرے منہ سے نکلا ہوا گانا ناحسبِ حال ہو چکا تھا۔
میں کھسیا گئی۔ مہرو کے کمرے سے یہی گانا ایف ایم پر سنتے ہوئے نکلی تھی۔

"اس کی تو عادت ہے۔ آجاؤ، اندر آجاؤ۔" عمو جان مجھے شرمندہ دیکھ کر بولے۔
"نہیں۔ میں آمنہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔" میں بجائے اندر جانے کے واپس مڑ لی۔
"سنو۔" اپنے کمرے کا راستہ ناپتے مجھے سبز پرلالہ نے روک لیا۔
"پھپھو کے گھر جا کر تم کچھ نہیں سیکھ سکتیں سوائے ان بے ہودگیوں کے۔ آئندہ مت جانا وہاں۔" وہ یہ حکم جاری کر کے چلے گئے۔
میں غصّے میں بھر گئی ـــ اور روشانے اور اپنے مشترکہ کمرے میں جا کر پھٹ پڑی۔
"طیبی آپو بالکل درست کہتی ہیں کہ سبز پرلالہ خان خود کو دادا جان کا جانشین خیال کر رہے ہیں مائی فٹ۔ کھاؤ ان کی مرضی سے، پہنو ان کی مرضی سے، کہیں جاؤ ان کی مرضی سے۔ میرے تو جیسے ازلی دشمن ہیں۔ ہزار آنکھیں ہیں ان کی اور اس میں نو سو پچاس آنکھیں تو مجھ ہی پر جمی رہتی ہیں۔" میں جل کر بولی۔
"اتنی مبالغہ آرائی تو مت کرو۔ اوّل تو تم کھاتی پیتی اپنی مرضی سے ہو۔ اور رہیں ہزار آنکھیں، تو ایمان سے دو ہی اتنی آفت ہیں، اگر ہزار ہوتیں تو جانے کتنی فوت ہو جاتیں۔ دو پر قتل ہونے والیوں کی تعداد گنی نہیں جا سکتی۔" اب آمنہ بی بی نے مبالغہ آرائی کے ریکارڈ توڑنا چاہے میں نے جواً کشن اسے رسید کیا۔
"ہوا کیا آخر؟" اس نے آگے ہو کر میرا ہاتھ کھینچ کر صوفے پر گرا دیا۔
"پھپھو کے گھر جانے پر پابندی لگا رہے تھے ان کے خیال میں طیبی آپو سے ہم بے ہودگیاں ہی سیکھ سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔"
"تو کچھ غلط تو نہیں کہہ رہے۔" روشانے بے موسم کی بارش کی طرح ٹپک پڑی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دونوں بھائی بہن آخر اس بے چاری کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو۔ بھئی اگر وہ آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگاتی ہیں، اور خود بھی آزاد گھومتی پھرتی ہیں تو یہ اُن کے والدین کی طرف سے اجازت ہے، جب انہیں یہ معیوب، ناگوار نہیں گزرتا تو ہم کون ہوتے ہیں۔ ان پر بے جا تنقید کرنے والے، ہر شخص اپنی سوچوں، خیالوں اور طور طریقوں میں آزاد ہے۔"
"بے جا تنقید تو خیر نہیں کرتے۔" روشانے کندھے اُچکا کر بیڈ پر کسی فلمی ہیروئن کی طرح گر کر انگڑائیاں لینے لگی۔
"لگتا ہے سبز پرلالہ سے پٹ کر آئی ہو۔"
"ارے بیٹے میری جوتی۔ بس موصوف کو شوق ہے سب کو ڈرائے دھمکائے رکھنے کا۔ اور میری تو نازک جان کے دشمن ہیں۔"
"خیر یہ انگڑائیاں بند کرو۔ میری قمیص پوری کی، یا یونہی مشین پہ چھوڑ آئی ہو۔ ایک شرٹ تو

م سے سی نہیں جاتی، تم زندگی میں کیا کر سکو گی۔"
یں نے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ وہ سیدھی قالین پر
آرہی۔ پھر کمر پکڑ کر چلائی۔

"جان کی دشمن ہو پوری۔ دیکھ تو آؤ اندھی سی
لا ہے، یہی کہنے آئی تھی۔ کہ پہن کر دیکھ لو۔" اس کا
کہا تھا کہ میں نے اسے گلے سے لگا لیا اور کمرے سے
ھاگ لی۔

یہ قمیص مجھے اپنے کالے پاجامے کے ساتھ
پہنی تھی۔ طینی اپو نے بلوایا تھا ہم سب کو، سوائے میرے
ادر کا— جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ سیاہ اور سرخ
رنٹڈ بارجیٹ کی یہ قمیص روشی نے بہت زبردست
وارجنٹ سی تھی، جو مجھ پر اچھی بھی بہت لگتی۔

"بالکل مغل شہزادی لگ رہی ہو۔" رالعہ نے
ریف کرنے میں قطعی کنجوسی نہیں دکھائی۔ یوں بھی
معاملے میں اس کا ریکارڈ بہت اچھا رہا تھا۔

"سبریز لالہ کو پاجامے سے بے انتہا چڑ ہے، ان
نظر نہ پڑ جائے۔ اس سے پہلے نکل بھاگو۔" آمنہ
دوپٹہ مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔ اور استری کا پلگ
کرنے لگی۔

"انہیں تو ہر اس فیشن سے چڑ ہے جو طینی اپو کرتی

میں نے بالوں کو پکڑ کر ہیر بینڈ سے جکڑا، اور
اس شکل میں بال یونہی کھلے چھوڑ دیے۔

پھپھو کے گھر جانے کی اجازت کوئی مسئلہ ہی نہیں
اور اتفاق سے اپو بھی باہر جا رہے تھے۔ مجھے
انے ڈراپ کر دیا۔

طینی اپو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، وہ ہمیشہ
ڈھیلی سی شرٹ اور جینز میں تھیں۔ بالوں
ربڑ لگا رکھی تھی۔ چہرے پر ڈھیر سارا لوشن تھوپا
ہاتھ میں نیل فائل جس سے ناخنوں کی تراش خراش
تھی۔ میں ان کے ہمراہ ان کے کمرے میں آگئی۔

ج تو بہت آفت لگ رہی ہو پری بیٹی۔" میں اس
پر شرما گئی۔

یہ پاجامہ کتنا سجتا ہے۔ یقیناً جینز بھی آفت
میں ہنس پڑی۔

"خیر، جینز وینز کی بات تو رہنے دیجیے۔ یہ بتایئے آپ کا سیمینار کیسا رہا؟"

"زبردست۔ تم نے سنا مجھے۔ کتنے زبردست دلائل کے ساتھ بات کی میں نے۔ مسز قریشی تو جل بھن کر رہ گئی تھیں۔" انہوں نے دراز سے البم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ جس میں ان کے سیمینار کی تصاویر تھیں۔ میں دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"یہ البم لے جاؤں اپو۔ وہاں منی وغیرہ کو دکھاؤں گی۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" انہوں نے بلا تامل البم میرے حوالے کر دیا، اور وہ میگزین بھی جن میں ان کے اس سیمینار کی تفصیل درج تھی۔

میں نے اس رپورٹ پر سرسری نظر ڈالتے ڈالتے چونک کر اوپر دیکھا۔ جہاں سیاہ رنگ سے بریکٹ میں رپورٹ "بلال احمد" لکھا ہوا تھا۔ مجھے بے اختیار روشانے یاد آگئی۔ میں دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

"تم یہ رپورٹ ضرور پڑھنا بلو نے بہت زبردست لکھی ہے۔" وہ الماری سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے بولیں تو میں نے حیرت سے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"بلو! کون بلو؟"

"بھئی، جس نے یہ رپورٹ تیار کی ہے مسز کرمانی کا بھانجا ہے اور۔" وہ مزید اس کا تعارف کراتے کراتے رک گئیں۔

"ابھی نہ جانا۔" انہوں نے باتھ روم کا رخ کیا، اور میں میگزین رول کرنے لگی۔

گھر آکر لڑکیوں کے آگے جو البم رکھی تو وہ سب ہی اس پر گویا جھپٹ پڑیں۔ میں نے میگزین کھول کر وہ صفحہ نکالا اور روشانے کے آگے پھیلا دیا۔

"تم یہ پڑھو، یہ اسی صحافی کے بچے نے لکھا ہے دیکھو شاید تمہارا ابھی کہیں ذکرِ خیر ہو۔" روشانے کے علاوہ باقی سب اس میگزین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم زیادہ فضول نہ بکا کرو سمجھیں۔" اس نے مجھے آنکھیں دکھائیں اپنی سبز کانچ جیسی آنکھیں۔

"پتا ہے منو! اس بدتمیز جرنلسٹ کو اپو اچھی طرح

جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں، کوئی مسز کرمانی کا بھانجا ہوتا ہے۔ خبر ہوتی تو اسی وقت ابو سے اس کی پٹائی کروا دیتے۔

”اونہہ! کوئی پٹائی وٹائی نہ کرتیں۔ ابو کو یہ سب معیوب کب لگتا ہے، ان کے خیال میں سرد تعارف حاصل کرنے کے لیے ایسی اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ جوان کی نظر میں قطعاً جائز ہے۔“ روشانے نے پھر جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اسے مزید چڑاتے چڑاتے رک گئی۔

”ابو۔ اگر بال تھوڑے سے اور بڑھا لیتیں تو اچھا لگتا۔“ مہران کی ایک تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھی۔

”بڑھائے بالوں کو ہی تو کاٹا ہے، اب کیا بڑھائیں گی، پرم کر کے انہیں مزید چھوٹا کرنے کے چکر میں رہتی ہیں۔ یہ اس عورت کو تو دیکھو ذرا۔ اس کے تو ابو سے بھی چھوٹے بال ہیں۔“ آمنہ کرب سے کراہی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر بالوں والی عورت کو مرد کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔“ اس نے گویا جھرجھری لی۔

”جس طرح لمبے بالوں والے مرد کو عورت۔“ میں نے کہا تو وہ سب ہنس پڑیں، اور تائید میں سر ہلانے لگیں۔

اس بھونڈے فیشن کی وبا ہمارے خاندان میں بھی پھوٹتے پھوٹتے بچی تھی۔ نئی نسل کا بانکا میرا عم زاد فیصل اپنی نوخیز مونچھوں کے ساتھ تو گوارا تھا۔ مگر جب بال گردن سے نیچے تک لے آیا تو یہ بولی وڈ کی فلموں کا دولہا ہم لڑکیوں کی آنکھ میں چبھا سو چچا کا کا جان اسے گردن سے پکڑ کر ہیر ڈریسر کے پاس لے گئے۔ وہ بھلا ایسے مرغوں کو کب گوارا کرتے تھے، جبکہ یہ نمونہ خود ان کا سپوت تھا بقول ان کے میں تو نسلاً مرغی نہیں ہوں۔ یہ اولاد۔ شکر تھا اس نے بھی بلا چوں چرا کیسے اپنا سر ہیئر ڈریسر کے سامنے جھکا دیا۔

اور جب وہ انسان کے روپ میں آگیا تو آمنہ نے تو اسے خوب چھیڑا۔ وہ پہلے ہی دل گرفتہ ہو رہا تھا، بقول اس کے اس قصائی نے تو اسے بالکل چھیل کر رکھ دیا تھا۔ مگر دوسرے لڑکے اس کے دل پہ مرہم رکھتے رہے۔ بقول ایمان کے۔

”فکر کیوں کرتے ہو، گھر کی کھیتی ہے پھر فصل اگ آئے گی۔“

”مگر اگتے اگتے آگے گی۔“ وہ منہ بسور کر رہ گیا تھا۔

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سر گلزار ہے کون

”زبردست!“ میں نے جھک کر مزید آگے پڑھا۔ یہ ڈائری یقیناً سبز ینہ لالہ کی تھی، مگر وہ کمرے میں موجود ہرگز نہیں تھی۔ میں کیا کرتی، آئی تھی انہیں بلانے۔ مگر۔ اس کھلے صفحے پر جو نظر پڑی۔ پڑھنے لگی۔

رات مہکی آئی ہے کہیں سے پوچھو!
آج بکھرائے ہوئے زلف طرح دار ہے کون
پھر در دل پہ کون دینے لگا ہے دستک
جانے پھر دل وحشی کا طلب گار ہے کون

”واؤ۔ تو یہ شوق بھی رکھتے ہیں۔“ میں نے جیسے ہی دوسرا صفحہ پلٹا کسی نے پیچھے سے ڈائری جھپٹ لی، میں پلٹی تو جم کر رہ گئی۔ سبز آنکھوں کی جگہ نگلتے ہیرے اس وقت شعلے اگل رہے تھے، میری پیشانی خوف اور شرمندگی سے یوں جلنے لگی۔ جیسے کسی نے جلتے شعلوں میں مجھے دھکیل دیا ہو۔

وہ کہاں سے برآمد ہوئے تھے، باہر سے، یا واش روم سے۔ بہرکیف اب رنگے ہاتھوں پکڑی جا چکی تھی۔ وہ بھی کسی کی نہیں سبز ینہ خان کی ذاتی ڈائری کو پڑھنے کا گناہ کرتے ہوئے۔ مگر خلاف توقع انہوں نے صرف۔ گھورنے پر اکتفا کیا، اور وہ ڈائری دراز میں پھینکنے کے انداز میں ڈال دی۔ پھر انتہائی۔ گرم لہجے میں بولے۔

”گیٹ لاسٹ۔“ ان کا تمام تر غصہ انگریزی کے ان دو جملوں میں دبا ہوا تھا۔ میں نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ پلٹ کر دوڑ لگا دی۔ اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر سانسیں بحال کیں۔ ابھی تک ستا جھوٹ جانے پر حیرت ہو رہی تھی۔

ایسی حرکت پہ وہ کم سے کم اور نرم سے نرم سزا میں بھی کھل کر تین طمانچے تو مار ہی دیتے، بہرحال بہ...

ان کے رویے نے حیران کیا وہیں احسان بھی کیا، اور تھوڑی دیر بعد منٹ کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھی ان کی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ پر ہی نہیں اس غزل پر بھی غور کر رہی تھی۔ جو بڑی رنگین تھی، مگر کسی شکستگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

"واؤ عشق، ہاں عشق" میں نے سیٹی بجائی۔

"کیا آ" آمنہ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے گرتے گرتے بچی۔ میں نے جلدی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"عشق۔ کک۔ کس سے کب ہوا؟" وہ ہونقوں کی طرح میرے سر پر آگری۔ میں نے اسے دھکیلا۔

"مجھے نہیں بابا! کسی اور کو ہوا ہے۔"

"کس کو۔ تم سے۔"

"کیا پاگل ہو رہی ہو؟ مجھ سے عشق کر کے کسی کو مرنا ہے کیا۔ بھئی اپنے سبز پری لالہ کی بات کر رہی ہوں۔" میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔

ایسا سخت گیر نظر آنے والا مرد۔ ایسی لطیف شاعری سے ڈائری سیاہ کر سکتا ہے جیسا حیرت در حیرت سے مری جا رہی تھی۔

آمنہ نے مجھے دھپ رسید کی۔

"ارے اشتہار نہ لگوا دینا۔ ان تک بھنک پہنچی تو خیر نہیں ہو گی تیری۔ اس بار بچ گئیں مگر اب معاف نہیں کریں گے وہ۔" اس نے مجھے گویا ان کے اس خطرناک سپوت کی دہشت سے ڈرایا۔ اور میں نے بھی ہونٹ سی لینے میں عافیت سمجھی۔

"مگر منو۔ ہے نا حیرت کی بات!" میری حیرت جوں کی توں قائم تھی۔ وہ سر ہلانے لگی۔

"چھتیس سال کے ہو گئے ہیں پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" آمنہ نئے نقطے میں الجھ گئی۔

"ہو سکتا ہے منو! عشق میں ناکامی ہو گئی ہو۔ آخر ڈائری بھی چودہ سال پہلے کی تھی۔"

"تو تمہارا خیال ہے چونتیس سال کی عمر میں انہوں نے عشق کیا تو پہلے کیا پڑھتے رہے تھے۔" آمنہ نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اس کے خیال میں پہلا عشق کرنے کے لیے یہ عمر تو کچھ ناموزوں تھی۔

اک لڑکی پاگل پاگل سی، رضیہ جمیل =/75
دردکے فاصلے، رضیہ جمیل =/150
میرے ندیم، رضیہ جمیل =/75
سوچ نگر کی رانی، رضیہ جمیل =/75
آنگن کا چاند، رضیہ جمیل =/75
دل ایک گلشن، رضیہ جمیل =/75
بے نام سی خلش، رضیہ جمیل =/75
شعاع، نادرہ خاتون =/100
حنا، نادرہ خاتون =/100
چلمن، نادرہ خاتون =/100
کنول، نادرہ خاتون =/50
عرفانہ، نادرہ خاتون =/45
دردانہ، نادرہ خاتون =/45
لبنیٰ، نادرہ خاتون =/50
شگوفہ، نادرہ خاتون =/45

اس پتے پر خط لکھیں،

۳۷، اردو بازار، کراچی

"بھئی ہوسکتا ہے اس بے چاری کو اس پتھر میں دراڑ ڈالنے میں اتنے برس گزر گئے ہوں اور جب دراڑ بڑی ہو گئی تو وہ خودکشی اور کسے دل کے خانے میں جبراً فٹ کر دی گئی ہو گی۔"

"توبہ، توبہ پلوشے تو کتنا کھلا کھلا بولنے لگی ہے۔" آمنہ اپنے صحت مند گال پیٹتے ہوئے مجھے فہمائشی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں کھسیا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ڈنر کے بعد ہم سب لونگ روم میں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ طیبنی آپو آگئیں۔ تقریباً پورا گھرانہ ہی یہاں جمع بیٹھا تھا۔ بچے پیچھے ٹی وی پر جھکے بیٹھے تھے۔ مردوں کی محفل میں سیاست زیرِ بحث تھی اور عورتوں کی نشست میں خالص زنانہ گفتگو جاری تھی۔ جب طیبنی آپو نے قدم رکھا تو سب نے بڑا رسمی سا خیر مقدم کیا۔ بس اپنی اپنی سیٹوں سے مسکراہٹیں اچھالیں۔ میں کھڑی ہو گئی، جبکہ دوسرا کھڑا ہونے والا سبز یزدان تھے، جو نہ صرف کھڑے ہوئے تھے بلکہ ناگواری کے تیوروں کے ساتھ کمرے سے واک آؤٹ کر گئے۔

"آؤ آؤ سلطانہ بیٹھو، یہ اچانک کیسے یاد آگئے ہم۔" آبی (دادی) نے اپنے قریب ان کے لیے جگہ بنائی۔

"بس آنٹی مصروفیت ہی ایسی رہتی ہے۔" وہ اپنے سیٹ کیے بالوں میں نفاست سے انگلیاں پھیرتے ہوئے شانِ بے نیازی سے امی کے پاس جا بیٹھیں۔

"بیٹا! رات تنہا نہیں آتے، دن میں آجاتیں۔ پھر اپنی امی کو ہی ساتھ لے آتیں۔" عمو جان کو ان کے یوں تنہا آجانے پر تشویش ہوئی۔

"ارے ماموں جان! اب وہ زمانہ نہیں رہا جب لڑکیاں اکیلے آنے جانے پر ڈرتی تھیں۔" انہوں نے عمو جان کے اعتراض کو ہنسی میں اڑا دیا۔

"کیوں اب ایسا کیا ہو گیا ہے۔ کیا عورت عورت نہیں رہی؟" سیف نے ہنس کر طنز کیا۔

"آج کی عورت بہت اسٹرونگ ہے، اسے اپنی عزت کی حفاظت کرنا آتی ہے۔"

"اوہ — وہ کیسے بھئی؟" ایمان نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

روشانے چائے سرو کرتے ہوئے بڑے طنز آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ ایسے مائی ڈیئر کزن کہ عورت کے اندر وہ جاہلانہ خوف نکل چکا ہے، آج کی ایجوکیٹڈ عورت سہاروں کی محتاج نہیں رہی، اس کا اعتماد بحال ہو چکا ہے۔"

"ان سب باتوں سے تو عزت اور جان کی حفاظت نہیں ہو جاتی۔" ایمان نے ٹکڑا لگایا "یہ تو صرف سوچیں ہیں اور سوچوں کا کسی غنڈے، بدمعاش، چور پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ تو صرف نہتی لڑکی کو دیکھے گا اور بس۔"

"تو کیا مردوں کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوتا؟" وہ جیسے جز بز ہو کر بولی تھیں، میرا دل چاہا کہ ایمان کو کس کر جوتا لگاؤں، اتنے دنوں بعد تو آئی تھیں آپو اور وہ بحث کی کوشش میں مصروف تھا۔ حد ہو گئی بدتمیزی کی بھی۔

"ہوتا ہے، کیوں نہیں ہوتا ہو گا۔ مگر عزت جان و مال سے قیمتی — ہوتی ہے اور۔"

"اوہو یہ کیا بے کار کی بحث چھیڑ بیٹھے تم لوگ! بس ہو گئی دفع کرو۔ لو طیبنی یہ چائے پیو۔" چچی نے درمیان میں مداخلت کر دی۔ اور طیبنی آپو نے بھی ایمان کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ گویا وہ بھی مزید بحث کے موڈ میں نہ تھیں۔ انہوں نے جاتے وقت ہم لڑکیوں کو کالج کے زیرِ اہتمام ہونے والے سیمینار کی دعوت دی۔

"دیکھو کالج سے سیدھی آجانا، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" انہوں نے ساتھ حل بھی پیش کر دیا۔ میری تو باچھیں کھل اٹھیں۔ مگر ان سبھوں نے خصوصاً روشانے نے تو صاف انکار کر دیا۔ رابعہ بھی اس کی ہمنوا تھی۔ مجھے تو ہر حال میں جانا ہی تھا۔ آمنہ اور مہرو کا انکار پھیکا سا تھا مگر ان دونوں کو قائل کر لیا۔ اور روشانے کو منانے کی بھی آخری کوشش کی، مگر وہ تو اپنے لالہ کی طرح اڑیل تھی۔

"وہاں وہ ڈھیٹ جرنلسٹ بھی ہو گا روشے۔" [illegible] نے اسے چھیڑا۔

"تیری راہ دیکھ رہا ہو گا۔" یہ گاتے ہوئے:

سنا تھا کہ وہ آئیں گے انجمن میں
سنا تھا کہ ان سے ملاقات ہو گی!

ہمیں کیا پتا تھا، ہمیں کیا خبر تھی
نہ یہ بات ہوگی، نہ وہ بات ہوگی

بقیہ آمنہ نے گا کر پورا کیا۔ جواباً روشانے نے مہرو کو گھونسا رسید کیا۔ جو اس کے جھکائی دے جانے پر میرے شانے پر پڑا۔

جرنلسٹ کے ذکر سے روشانے اور بھی دبک گئی تھی۔ اب تو اس کی ناں کو ہاں میں بدلنا ناممکن تھا۔

"مسئلہ یہ ہے جاہل لڑکی کہ تم دونوں کالج سے آجاؤ گی تو ہم تینوں کی گمشدگی لازماً گھر والوں کو کھٹکے گی۔" اس نے جل کر کہا۔

"ہم کہہ دیں گے ان تینوں کا پریکٹیکل ہے، اس لیے وہ لیٹ آئیں گی۔" روشانے کی چھوٹی سی عقل نے تجویز پیش کی۔

"اور جو پوچھا کون سے پریکٹیکل، ان کے حافظے میں تو نہیں ہے کہ نہ ہم ڈاکٹر بن رہے ہیں، نہ انجینئر ہمارے تو فرشتے بھی سائنس نہیں پڑھ رہے۔"

"لعنت ہو تمہاری ان مرغی جیسی عقلوں پر اور یہ سنہری آنکھوں والیاں تو ہوتی ہی پیدائشی کم عقل ہیں۔" روشانے نے جانے کب کا بدلہ تم تارا۔ میں نے اسے گھورا۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی، اب دوپہر کو گھر پر صرف خواتین ہوتی ہیں۔ وہ بھی ہمارے گھر کی اللہ والی۔ بھلا انہیں کیا پتا کہ پریکٹیکل صرف سائنس والوں کے ہی ہوتے ہیں۔"

روشانے نے واقعی چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیا۔

دوسرے دن ہم کالج سے سیدھے الحمرا پہنچے۔ مگر استقبالیہ پر میں ٹھٹھک گئی۔

"منی۔ وہ جاہل جنگلی جرنلسٹ بھی ہے۔" بتیس

"واہ کیا ہیم کی گردان ہے۔" مہ نالی اپنی دانتوں کی نمائش کرنے لگیں اور دور کھڑا وہ جرنلسٹ کا بچہ۔ (جو آج نامانک سک سے تیار ہو کر آیا تھا بہت اچھا لگ رہا تھا) اب مسکراہٹ کو وش سمجھ کر ہماری طرف دوڑا چلا آیا۔

"السلام علیکم۔"

ہم تینوں خاموشی سے اس کا منہ دیکھتے رہے۔

"دیکھیے سلام کا جواب دینا اخلاقاً بھی ضروری ہے۔" اس نے ہمیں اخلاق کا سبق پڑھایا۔

"ہاں، مگر جو قابل ہوں۔"

"کیا مطلب ہے؟" اس نے مجھے دیکھا۔

"دیکھیے مسٹر، شرافت سے چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

"آپ کے آنے سے پہلے بھی میں شرافت سے ہی چل پھر رہا تھا۔" وہ جانے کسی ڈھیٹ جانور کا گوشت کھا کر آیا تھا، پھر یہاں وہاں دیکھ کر کچھ مایوس انداز میں بولا۔

"غالباً آپ پانچ ہوا کرتی تھیں، دو شاید نہیں آئیں۔" اس نے دوشا نے کی کمی محسوس کرتے ہوئے انتہائی افسردگی سے ہم تینوں کو دیکھا۔

"دو کا تکلف تو رہنے دیجیے، آپ تو ایک ہی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے ہیں؟"

میں طنز سے ہنسی تو وہ سر جھکا کر ہنس پڑا۔

اسی وقت طیبی آپو چلی آئیں۔

جارجٹ کی سیاہ ساڑھی میں کھلے گلے اور بغیر آستین کے بلاؤز میں وہ اپنی بے حد گوری رنگت کے باعث اتنی ایکسپوز ہو رہی تھیں کہ ہم ہی کیا ایک لمحے کو بلال احمد بھی نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

ان کا یہ حلیہ دیکھ کر ہم تینوں کے دل پر دھچکا سا لگا۔ البتہ وہ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش دکھائی دینے لگیں۔ اور بلال احمد سے تعارف کرانے لگیں۔

"ہیلو! ان سے ملو یہ میری بہت ہی سویٹیس سی کزنز ہیں، یہ آمنہ ہے، یہ مہرالنساء ہے اور یہ یلوشہ ہے۔ اور بھئی تم لوگ اس سے ملو۔ یہ بلال احمد ہیں ایک قابل جرنلسٹ اور قابل بزنس مین بھی۔ بہت نائس لڑکا ہے، ارے بھئی آمنہ تم لوگ روشانے کو نہیں لے آئیں۔"

انہوں نے تعارفی مراحل طے کرنے کے بعد پوچھا روشانے کے ذکر پر اس جرنلسٹ کا چہرا چودھویں کے چاند کی طرح چمک اٹھا۔

"اس کے سر میں درد تھا آپو۔ جو یہاں آ کر مزید بڑھ جاتا۔" آمنہ نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے جواب پر مسکرانے لگا۔ پھر دوسری طرف چل دیا۔

اس بار طیبی آپو خطاب کرنے آئیں تو ہم نے ہمہ تن گوش ہو کر ان کی تمام باتیں سنیں۔ پُرزور تالیاں بھی بجائیں۔

واپسی پر طیبی آپو نے اپنی گاڑی میں ہمیں جلال بابا ڈراپ کیا۔ مگر قسمت یہاں بری طرح خلاف ہو گئی۔

سبز بیز خان نے ہمیں ہال سے نکلتے اور طیبی آپو کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے آفس سے لنچ کے لیے گھر آ رہے تھے۔

آ گئے۔ پیچھے ہی ہماری گاڑیاں رکی تھیں، طیبی آپو تو بے خبر ہاتھ ہلاتی گاڑی لے آ رہیں۔ اور ہم تینوں اندر کو بھاگ آئے مگر اب خوف سے برا حال لیے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

"اب کیا ہو گا؟" میں آمنہ سے، آمنہ مہرو سے، اور مہرو مجھ سے، پوچھے جا رہی تھی۔ روشانے تو خود کو بال بال بچا دیکھ کر شکر ادا کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ بری حالت میری تھی، میں تو یوں بھی اس شخص کے عتاب کا نشانہ بنتی تھی۔

جانے کیا بات تھی ان کا ڈر بچپن سے جو دل میں سما گیا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا تھا۔ میں دنیا میں اگر کسی سے ڈرتی تھی، تو وہ سبز بیز حیات خان تھے، ان کی سبز سبزہ زاروں جیسی آنکھیں دنیا والوں کے لیے نشیلی ہوش ربا ہوں گی، مگر میرے لیے تو خون آشام، تیغ صفت تھیں۔

پتا نہیں میری حرکتیں ایسی ہوا کرتی تھیں جس پر پھٹکار پڑے یا وہی میری جان کے دشمن بنے تھے۔

شام کی چائے پر ہمارا ان سے مڈبھیڑ ہونا ضروری ہو گیا۔ ظاہر ہے ہم تینوں کمرے میں بند تو رہ نہیں سکتے تھے۔ شام کی چائے سرو کرنا میری اور آمنہ کی ذمہ داری تھی۔ میں چائے سرو کر رہی تھی جب مگ ان کی طرف بڑھایا انہوں نے چائے کا مگ تھامتے ہوئے بغور میری طرف دیکھا۔

"کالج کے بہانے کہاں جاتی ہو تم"۔ انہوں نے صرف "تم" کہہ کر گویا مجھے ہی مجرم ٹھہرایا تھا۔ آمنہ اور مہرو دروازے میں ہی دم سادھے کھڑی رہ گئیں۔

"کک۔ کالج ہی جاتے ہیں ہم تو۔"

"مگر آج۔ میں نے تمہیں کالج وین میں نہیں دیکھا بلکہ تم" انہوں نے دانستہ جملہ پورا نہیں کیا۔ ساری خواتین میری طرف متوجہ ہو گئیں، خاص کر ابی جی (تائی) کی آنکھوں میں شکوک لہرانے لگے۔

"جی وہ آج طیبی آپو نے ہمیں کالج سے پک کیا تھا اور" میری آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ کمرے میں یکلخت سکوت چھا گیا۔

"یہ اس کے جھوٹ بولنے پر ہے۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"سنبھالیں چچی اسے، ورنہ یہ بھی ہاتھوں سے نکل جائے گی"۔ انہوں نے مجھے امی کی طرف دھکیل دیا اور لونگ روم سے نکل گئے۔

امی میری طرف بڑھیں کہ آمنہ بھاگ کر درمیان میں آ گئی۔ پتا نہیں اس نے وہاں موجود خواتین اور امی کو کیا وضاحتیں پیش کرنی شروع کر دیں میں اپنی ہتک کا احساس دل پر لیے کمرے سے بھاگ نکلی۔

میری روح پر گویا اس شخص نے انگارے رکھ دیے تھے۔ لہو میں کھولن ہونے لگی۔

میں لان کے پچھواڑے ــــــ جا کر چنبیلی کی باڑھ کے پاس بیٹھ کر تذلیل کے یہ آنسو بہانے لگی۔ ایسا تو گمان تک نہیں تھا کہ وہ صرف مجھے ہی ٹارگٹ بنائیں گے، اور یوں سب کے سامنے ذلیل کر دیں گے۔ آخر کیا حق پہنچتا ہے ان کو مجھ پر۔

کیوں امی نے، چچی نے کسی نے بھی ان کا ہاتھ نہیں روکا۔ آخر ان کی نظر میں قصوروار میں ہی کیوں۔

میں گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ تب آمنہ اور روشانے میرے پاس آ گئیں۔

"لالہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہت سرپرائزنگ بی ہیویر تھا ان کا۔ میں تو اب تک حیران ہوں۔ انہوں نے جب تینوں کو دیکھا تھا تو صرف تمہیں کیوں۔"

روشانے مارے شرمندگی اور دکھ کے میرے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"تمہارے لالہ بچپن سے میرے دشمن ہیں۔" میں سلگ کر بولی۔

"مجھے یاد ہے جب میں نے میٹرک پاس کیا تھا تو انہوں نے ابو سے میری پڑھائی چھڑوانے پر زور دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ ان کے خیال میں بہت ال مینرڈ، بدتمیز اور جھگڑالو ہوں۔ اس لیے مجھے سبق سکھانے کے لیے کالج میں ایڈمیشن نہ دلایا جائے۔ اس طرح

ایک بار میری کسی ضد پر انہوں نے میرا منہ طمانچوں سے سُرخ کر دیا تھا — ابو۔ اور عمو جان سے یہ کہا، کہ میں نے انہیں گالی دی ہے، اس لیے انہوں نے مجھے مارا ہے۔" میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میرا دل ان کے خلاف غم و غصے سے بھر گیا۔ روشانے اور آمنہ زبردستی مجھے اندر لے آئیں۔

ابو نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی، اس لیے کہ انہیں آمنہ نے مطمئن کر دیا تھا۔ مگر میرا دل اندر سے جل رہا تھا اور دو دن تک ایسا ہی موڈ رہا۔ جہاں اس ظالم سفاک شخص کو دیکھتی، منہ پھیر کر دوسری طرف نکل جاتی، جب تک وہ کھانے کی میز پر ہوتے میں کچن میں بلا ضرورت چیزوں کی ترتیب درست کرتی رہتی۔ شام کی چائے بھی مہرو سرو کر کی تھی۔ مگر بہر حال۔ ایک گھر میں رہ کر کب تک یوں چل سکتا تھا، جبکہ وہ شخص تو اب ایسا انجان تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

اس روز پھپھو اور طیبی الو آگئیں، پتا چلا ان کی منگنی ہو رہی ہے، وہ دعوت نامے ساتھ لائی تھیں،

"بلال ہاؤس کے مرد خفا ہو رہے تھے، ان کے خیال میں ان کی اکلوتی بہن انہیں بالکل غیروں کی طرح اطلاع دینے آئی تھیں اور دوسرا غصہ انہیں غیروں میں بیٹی دینے پر تھا۔ عمو جان تو سخت نالاں تھے۔

"اپنوں میں نباہ نہیں ہو سکتا تھا نا، لالہ۔" پھپھو رسانیت سے بولیں اور چمکتا کارڈ میز پر رکھ دیا۔

طیبی الو کو ہم قیصوئی ممی کے کمرے میں گھیرے بیٹھے تھے، انہوں نے پرس سے اپنے ہونے والے منگیتر کی تصویر نکال کر دکھائی، جسے دیکھ کر ہم سب کو زبردست جھٹکا لگا۔

"ہائیں الو ان کے بال تو آپ سے بھی بڑے ہیں، بلکہ مجھ سے بھی۔" آمنہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اسے بروقت پانی مل گیا۔

یہ سچ تھا ابرار احمد جو طیبی الو کے منگیتر ہونے والے تھے، ان کے بال کندھے پر کسی ہیروئن کی طرح اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

"کون سا تیل استعمال کرتے ہیں، خاصے گھنے اور چمک دار ہیں بال تو۔"

آمنہ ان کے بالوں کو رشک سے دیکھ رہی تھی۔ طیبی الو اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔ پھر ہمارے جاری تبصروں کا قطعی بُرا مانے بغیر مسکراتے ہوئے تصویر پرس میں رکھ لی۔

"بھئی، جدید اور بدلتے فیشن اپنانے کا حق صرف عورتوں کے لیے تو مخصوص نہیں ہے نا۔ مرد بھی اس معاملے میں آزاد ہیں۔ مجھے تو کم از کم ایسے ہی مرد پسند ہیں، جو زمانے اور وقت کے ساتھ چلیں۔" ان کے لہجے میں اپنے منگیتر کے لیے فخر تھا۔

"اب آپ ہی کو یہ گنگنانا پڑے گا کہ

؎ ظفر اس کی زلف میں دل ہے میرا
میرے پاس بلا سے رہا نہ رہا

میں شرارت سے بولی تو سب ہنس پڑیں۔ طیبی الو بھی خاصی محظوظ ہوئیں۔

ان کی منگنی کی تقریب میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا، یوں ہم سب کو اپنی تیاریاں ارجنٹ کرنا پڑیں۔

جم خانہ لان لمبر دو میں برقی قمقموں کی بہاریں اُتر آئی تھیں۔ خوبصورت حسین اور وسیع اسٹیج پر مخملی کرسیاں دولہا دلہن کی منتظر تھیں۔

ہمارے گھرانے کی روایت سے ہٹ کر یہ منگنی خاصے ماڈرن انداز میں ہو رہی تھی۔ طیبی الو اور ابرار احمد ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سُرخ کارپٹ کی بنائی ہوئی روش پر چلتے ادھر ادھر لوگوں کو ہیلو ہائے کرتے مووی کی تیز لائٹوں میں اسٹیج تک آئے ——— ہم سب لڑکیاں لہنگے سوٹ میں ملبوس اسٹیج پر انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔

"بھئی دھیرج دھیرج، ہم انہیں رخصت کرا کے بالکل نہیں لے جا رہے ہیں، ابھی یہ آپ ہی کی ہیں۔" ایک موقع پر ابرار بھائی نے ہمیں شرارت سے چھیڑا۔ تو ہم ہنس پڑے۔

"ہائے روشانے۔ وہ جرنلسٹ۔"

آمنہ نے ہم سب کی توجہ اسی جانب کرائی جہاں وہ جرنلسٹ بلال احمد سفید شلوار سوٹ گرے کلر کی واسکٹ میں ایک شان کے ساتھ ایک خاتون کے ہمراہ اسٹیج ہی کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں چند بجی سنوری لڑکیوں نے اسے روک لیا تھا۔ کچھ دیر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر اس

سے پہلے وہی دو لڑکیاں اسٹیج تک آگئیں بتایا گیا وہ دولہا کی بہنیں یعنی طینی اور الو کی نندیں تھیں۔ سلام دُعا کے بعد انہوں نے یکدم روشانہ کو گھیر لیا۔

"اچھا تو آپ ہیں روشانے۔" روشانے سٹپٹا کر ان کے ساتھ لگی۔

"بہت تعریفیں کرتے ہیں بھائی آپ کی!"

"ارے رے ابھی میں نے کب کی ہیں ان کی تعریفیں؟ میں نے تو انہیں دیکھا بھی پہلی بار ہے۔" ابرار بھائی مصنوعی گھبراہٹ سے بولے۔ "اتنی ساری سالیاں ہوں گی مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔"

"ارے آپ کی نہیں بلال بھائی کی بات کر رہی ہوں۔" طینی اور الو کی نند ہنس کر وضاحت کرنے لگیں اور ادھر ہم سب حیران پریشان رہ گئے پھر کہیں جا کر پتا چلا کہ بلال احمد یعنی وہی جاہل ڈھیٹ ضیاقی ابرار بھائی کا سگا بھائی اور طینی اور الو کا دیور ہے۔ وہ اسٹیج پر آیا تو انتہائی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سب کی خیر خیریت دریافت کی ہمارے خاندان کے رنگوں سے علیک سلیک کی پھر ایک موقع پر روشانے کی تصویر کھینچ لی میں نے اس کی یہ چوری پکڑ لی۔

"دیکھیے ایک تو ماشاء اللہ ذہین بہت ہیں اوپر سے آنکھیں بھی بڑی بڑی ہیں سب دیکھ لیتی ہیں اب جان ہی گئی ہیں تو آپ سے کیا چھپانا۔" اس نے اعتراف کر ڈالا کہ وہ روشانے بی بی کے آگے دل و جان ہار چکا ہے!

"مگر تصویر کھینچنا تو کچھ اچھی بات نہیں ہے۔"

"ڈونٹ وری میں اسے واپس کر دوں گا۔" وہ شرافت کی جون میں تھا میں ہنس کر وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر جا کر آمنہ اور مہر کے کان میں پھونک دیا اور جانے کیسے روشانے کے کان میں بھی جا پڑی گویا میری پھونک صور بن کر دوڑی تھی۔ وہ ہم سب پر بپھر دوڑی۔

"تم لوگ اس کا ساتھ دے رہی ہو اس کمینے لوفر کا۔ میں جان نکال دوں گی اس کی۔ دانت توڑ دوں گی۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی" بمشکل اپنا گھیردار لہنگا سنبھالتی یوں تنتنا کر گئی تھی کہ واقعی آنکھیں اور دانت ہتھیلی پر لے کر ہی آئے گی۔ مگر کوئی پندرہ منٹ بعد انتہائی حواس باختہ اور سرخ ٹماٹر جیسا چہرہ لے کر لوٹی۔ ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی وہ کھسیا کر مجھے مکے مارنے لگی۔

"ذلیل انسان ہے پورا۔"

"کیا عشق کا افسانہ سنا دیا۔" آمنہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"میں نے اس کی ٹھیک ٹھاک دھنائی کی ہے۔" وہ مری مری آواز میں بولی مگر ہمارے جواباً داغے گئے قہقہوں پر کھسیا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

رات وہ میرے نزدیک لیٹی اور میرے شانے پر سر ڈال کر عجیب یاس بھرے لہجے میں بولی۔

"رشی! وہ چاہتا کیا ہے آخر؟" اس کا اشارہ بلال احمد کی طرف تھا۔

"تمہیں چاہتا ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ اچھل پڑی۔ مگر مجھ سے نظریں ملیں تو کھسیا کر سابقہ حالت میں لیٹ گئی اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی۔

"انتہا سے زیادہ احمق لگ رہی ہو تم۔" میں نے سیدھا بیٹھ کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" اس پر سنجیدگی کا اٹیک ہوا تھا یا کسی اور احساس کا۔

"کیا مطلب؟ کیا ممکن نہیں؟"

"یہی۔ جو وہ چاہتا ہے؟"

"وہ کوئی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا تو نہیں کہہ رہا۔ جو ناممکن ہو (خیر ناممکن تو وہ بھی نہیں رہا)"

اس نے اچانک میری طرف سے کروٹ لے لی۔ اور میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر لیمپ کا بٹن آف کر دیا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

"روشانے۔" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ عجیب گھٹی گھٹی سی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کا رُخ میں نے اپنی طرف کیا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی، میری گود میں سر رکھ کر کھل کر رونے لگی۔

"کس سے سبز پرزالہ سے؟"

"نہیں بلال احمد سے۔" وہ آنسوؤں کی یلغار میں بولی تو میں بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ کو نہ روک سکی۔

"جہاں تک میرا خیال ہے نہ تو وہ بھوت ہے نہ جن

نہ کوئی اور خوفناک بلا۔ چلو ابھی سو جاؤ۔ صبح کالج بھی جانا ہے وہیں کچھ سوچتے ہیں۔"

میں نے اسے تھپک کر سلا دیا۔ پتا نہیں وہ سوئی یا نہیں البتہ مجھ پر نیند نے جلد ہی غلبہ پا لیا تھا۔

سبزخان کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم ٹھٹھک گئے، دروازہ نیم وا تھا مگر کھڑکی کھلی تھی۔ اندر سے ڈیک کی دھیمی آواز باہر آ رہی تھی۔ میں نے یونہی غیر ارادی طور پر کھڑکی کا پٹ کھول کر اندر جھانکا۔

وہ بیڈ پر نیم دراز تھے۔ سینے پر موٹی سی کتاب اوندھی پڑی تھی۔ اور ان کی خوبصورت آنکھیں پنکھے پر مرکوز تھیں۔

وہ غزل میں گم تھے یا کسی اور سوچ میں گم میرے لیے یہ بڑا عجیب منظر تھا۔

اتنا سخت گیر، کم آمیز دکھائی دینے والا شخص، اتنی لطیف غزل اور شاعری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"یلو شرہ!" ان کی بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میری جان نکل گئی۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا میں نے جلدی سے کھڑکی سے منہ نکال لیا جو بے خیالی میں خاصا اندر تک جا گھسا تھا۔

"اندر آؤ۔" اس حکم نے میرے حواس چھین لیے۔ میں جل تو جلال تو کا ورد کرتی ان کے حکم کی تعمیل میں اندر آئی۔

وہ بیڈ سے اتر گئے اور ٹیپ کا بٹن کھٹ سے بند کر کے میری طرف دیکھنے لگے، وہ خوبصورت مگر میری جان نکال دینے والی آنکھیں۔

"کیا ہو رہا تھا یہ؟" سیدھا سوال داغا گیا۔

"ک۔ک۔ کچھ نہیں۔"

"تم کب سدھرو گی۔ اب تم بی۔ اے کی اسٹوڈنٹ ہو۔ کوئی اسکول گرل نہیں۔" اس کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔

"کسی کی پرائیویسی میں مداخلت کرنے کی کیا سزا ہے جانتی ہو۔" لفظ سزا پر میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

"ج۔ جی میں نے مداخلت تو نہیں کی بس ذرا سا جھانکا ہی تو تھا وہ بھی کمرے میں کوئی دل میں تو نہیں۔" میں بلا سوچے سمجھے بول گئی، مگر دوسرے لمحے شپٹا گئی۔ ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ جبڑے بھینچے مجھے اور درشتگی سے گھورنے لگے۔

"گیٹ لاسٹ!" پھر گرج کر کہا۔ مجھے تو سر دوالفظ

بڑے غنیمت لگے، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پلٹ کر دوڑ لگائی مگر بدقسمتی سے دروازہ نیم وا تھا۔ نتیجتاً دھاڑ سے ٹکرا گئی۔ دن میں تارے جگنو چاند سبھی دو ایک پل میں جلوے دکھا گئے۔

ناک ایسی ٹکرائی تھی کہ آنکھوں میں تیکھے تیکھے مرچیں لگاتے آنسو آ گئے۔ مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جسارت نہ کی اور دھندلائی آنکھوں سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ پھر اوپر جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناک سہلانے لگی۔ معاً سامنے نظر میں گیئں تو جھینپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دریچے میں کھڑے بڑے سرسری انداز میں ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ میرے سر اٹھانے پر سلائنڈر کھڑ ہچ سے بند ہو گیا۔ اور میں کمرے میں آ کر آیوڈیکس ڈھونڈنے لگی تبھی دھماکے سے دروازہ کھلا اور روشانے کا ہونق چہرہ نمودار ہوا۔

"ہائے وشی!" اس نے اپنا مخصوص انداز اختیار کیا جو کسی خطرے کی طرف اشارہ تھا۔

اتنی اتنی بات پر بھی وہ یوں حواس باختہ ہو جاتی جیسے خدانخواستہ جنگ چھڑ گئی ہو۔ میں اطمینان سے بیٹھی رہی۔

"پلیز شے! اس صمانی کے بچے نے فون کیا ہے۔" اپنے تبز سبز سہرے بہارٹ اس موجودہ خطرے کی اطلاع دی میں اچھل پڑی۔

"کیا۔ آ۔ صمانی کے بچے بھی ہیں۔ دھوکے باز فراڈی۔"

"اوہو! بچے نے نہیں خود اس صمانی نے کیا ہے۔ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ برا مان گئی۔ اس کے خیال میں ایسی خطرناک صورتحال میں مجھے ایسے بھونڈے مذاق کی نہیں سوجھنی چاہیے تھی۔

"کیا کہہ رہا ہے۔" مجھے حیرت تو ہوئی مگر اتنی نہیں جتنی روشانے بیچاری تصور کر رہی تھی۔

"پتا نہیں۔ میری آواز سن کر وہ جانے کیا کیا بولنے لگا۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔"

"کون سی زبان بول رہا تھا۔"

"وشی! تجھے مذاق کی سوجھ رہی ہے۔ پتی میں تو منا کو رسیور پکڑا کر بھاگ آئی۔ ہائے پلیز شے گھر میں سبرینہ خالہ بھی ہیں اور بھی اگر کسی کو خبر ہو جاتی پھر۔" وہ وہیں بیڈ پر نیم جاں لڑھک گئی۔

"کیا۔ تم نے رسیور منا کو پکڑا دیا۔ بے وقوف احمق۔ تمہیں پتا نہیں یہ میری ہونے والی بھاوج ہے اگر اس چلا کو

معاف کے جال میں پھنس چکی ہیں، میرے ارباز لالہ کا مستقبل تو تاریک کنواں ہو کر رہ جائے گا اور دل۔" میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ تڑاخ سے ربڑ کی چپل میری پیٹھ کو دہکا گئی۔ آمنہ چپل داغنے کے بعد بھی دروازے پر خطرناک تیوروں کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر دوسری چپل اٹھا کر کس کر روشانے کو بھا دی۔ وہ ہائی کر کے اچھل پڑی۔

"مجھے اس جاہل، جنگلی کا فون پکڑا کر خود بھاگ آئیں کیا وہ میرا ہوتا سوتا لگ رہا تھا۔"

"ہوا کیا؟ کیا کہہ رہا تھا؟" میں پیٹھ سہلاتی اس کی طرف مڑی۔

"کہنے لگا کیا۔ میری آواز سن کر کچھ دیر سناٹے میں رہ گیا پھر ایک گہری افسردہ سی آہ بھر کر کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔ اور یہ تم کیا بکواس کر رہی تھیں یہاں بیٹھ کر۔ میری مٹ ماری گئی ہے جو میں اس جرنلسٹ کے بچے سے پینگیں بڑھاؤں گی۔ یہ اپنی روشانے کو ہی مبارک۔ اس کی احمقانہ باتوں سے اپنے کالم بھرتا ہے عمر بھر۔" وہ بیڈ پر گر گئیں۔ روشانے کا منہ لال ہو گیا۔

"اسے فون نہیں کرنا چاہیے تھا آمنہ تم نے اسے کہہ نہیں دیا کہ آئندہ وہ ایسی جراٴت نہ کرے۔" اس کے چہرے پر اب تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ارے! اس نے سنا ہی کب۔ اور جو تم گٹ پٹ کر رہی تھیں کہہ دیتیں۔"

"میں کوئی گٹ پٹ نہیں کر رہی تھی۔" روشانے اس الزام پر بھبھک اٹھی پھر یکدم دونوں کی نظریں میری ناک پر پڑیں اور حیرت سے وہیں جم گئیں۔

"بڑا ہی دل خراش حادثہ ہوا ہے، یہ اس کی نشانی ہے۔" میں نے آیوڈیکس ملتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں دکھڑا رویا۔

"ہوا کیا؟"

"بس بند دروازہ دکھائی نہ دیا۔ ویسے روشانے یہ بات تو تشویش کی ہے کہ اگر اس جرنلسٹ نے یہاں پھر فون کیا یا کہ کرتا رہا تو کیا ہو گا۔" میں نے ان دونوں کا دھیان پھر اپنی ناک سے ہٹا دیا۔

"تو کچھ کرو نا تم لوگ۔" روشانے کی حالت پھر پتلی ہونے لگی۔ "کیوں نا طینی آپو سے شکایت لگائیں آخر ان کا دیور لگتا ہے۔" آمنہ نے آئیڈیا پیش کیا۔ "اور مجھے تو موقع چاہیے تھا پھپھو کے گھر جانے کا۔"

ہم شام ہی ان کے پاس پہنچ گئے۔ طینی آپو فون پر اپنے منگیتر سے ہنس ہنس کر باتیں بگھارتی ملیں۔ ہم کچھ دیر پھپھو کے پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہیں خدا خدا کر کے وہ فون بند کر کے آئیں۔

"آخاہ زہے نصیب تو روشی بی بی بھی آئی ہیں۔" وہ روشانے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

ہم ان کے بیڈ روم میں آ گئے پھر یہاں وہاں کی باتوں کے بعد اصل موضوع پر آ گئے۔ مدعا عرض کیا پہلے تو وہ حیران رہ گئیں پھر ہنس پڑیں۔

"میرا خیال ہے اپو! ہم نے لطیفہ نہیں سنایا آپ کو۔" میں بگڑ گئی۔

"اوہ ڈارلنگ۔ یہ کوئی ایسا خطرناک مسئلہ تو نہیں ہے جو اتنی ہراساں نظر آ رہی ہو تم لوگ۔ میرا تو جلال ہاؤس کی لڑکیوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

انہوں نے واقعی ماتم کناں نظروں سے ہی ہم سب کو گھورا۔

"سب تو تم جاہل لڑکیوں کی طرح مردوں کی ذرا ذرا سی توجہ پر گھبرا کر رہ جاتی ہو۔ یہ بتاؤ روشی نے بھی بلو کیا لگتا؟" انہوں نے اپنا رخ سخن روشانے کی طرف کیا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"آپ کو بتانے کا مقصد یہی ہے کہ آپ اپنے اس دیور کو سمجھائیں بلکہ نکیل ڈالیں۔" وہ بیڈ سے اتر گئی۔

"کیا سمجھائیں؟" انہوں نے مسکراتی آنکھیں روشانے کے چہرے پر جما دیں۔

"یہی کہ۔ اوہو۔ اپو آپ آخر سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔" اس نے الجھ کر ہماری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا مجھے ہنسی آ گئی مگر بظاہر سنجیدگی سے بولی۔

"اپو اس سے کہیے کہ کم از کم وہ جلال ہاؤس میں فون نہ کرے۔"

"تو کہاں کرے۔" وہ ہنس پڑیں۔ "بھئی دیکھو نا بی بی تو ان باتوں کو قطعی معیوب نہیں کہتی۔ اور پھر محبت تو وہ چشمہ ہے جو پہاڑوں سے خود بخود نکل آتا ہے۔ تم پانی کو روکو گی تو کیا وہ رک جائے گا۔ ہرگز نہیں، دوسرے

رُخ پر پہنا شروع کر دے گا مگر ہے گا ضرور۔ محبت درِ اصل "

"الو بلیز ہم محبت پر لیکچر سننے ہرگز نہیں آئے"۔ روشانے باقاعدہ ناراض ہونے لگی۔

"اوکے۔ خفا مت ہو، میں بات کرتی ہوں بلو سے۔ ویسے بلو کی چوائس ٹھیک ٹھاک ہے۔ بڑا چھپا رستم نکلا وہ تو"۔ وہ روشانے کو دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ روشانے کا منہ خجالت اور خفت سے قابلِ رحم ہو گیا۔

ملیحی الو کے یہاں سے واپس آئے تو ہم قدرے مطمئن ہو چکے تھے ہمیں یقین تھا وہ اب اپنے ہونے والے کھلنڈرے منچلے دیور کو سنبھال لیں گی مگر یہ ہماری خوش فہمی یا کم فہمی نکلی۔

ہفتہ بھر بعد وہ اپنی ہونے والی ساس کے ساتھ خود بنفس نفیس آدھمکیں اپنے اس شترِ بے مہار دیور کا پرپوزل لیے۔

ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔

جلال ہاؤس کی خواتین کے لیے بھی یہ تحیر کا باعث تھا خیر انہوں نے تو یہ کہہ کر انہیں رخصت کیا کہ جلال ہاؤس میں سارے فیصلے مردوں کے ہوتے ہیں ہم آپ کا مدعا ان کے آگے رکھ دیں گے۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے فیصلہ کریں گے۔

ادھر روشانے جھینپ ـــــ رہی تھی۔ اور ہم سب ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔

"اسے کہتے ہیں الٹی ہو گئیں سب تدبیریں"۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما تو اس نے خفگی کے عالم میں مجھے دور دھکیل دیا۔

"اسے تو کیوں فکر کرتی ہے۔ عمو جان کھٹ سے ناں کر دیں گے"۔ مہرو اپنے تئیں اسے تسلی دے رہی تھی مجھے ہنسی آگئی۔

(اب ایسی بھی کوئی خواہش یقیناً اس کی نہیں تھی۔) مگر واقعی مہرو کی بات سچ نکلی۔ عمو جان سے پہلے سبز لالہ نے اس پرپوزل پر انکار کا ٹھپہ لگا دیا۔ انہوں نے تو بس اتنا ہی سنا کر سلطانہ جہاں آفریدی کا ہونے والا دیور ہے۔ اور پیشانی پر آڑے ترچھے بل پڑ گئے۔

چچیوں نے دبا دبا احتجاج کیا کہ "لڑکا بے حد لائق فائق ہے۔ باپ کا پورا بزنس سنبھالا ہوا ہے۔ صحافت محض شوقیہ کرتا ہے۔ خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے اگر غور کر لیا جائے تو کیا حرج ہے"۔

"کچھ نہیں سوچنا۔ نہ جان نہ پہچان ہم کیوں غیروں میں بیٹی دے دیں"۔ سبز لالہ کے تیور اتنے برہم تھے کہ عورتیں بیچاری دبک گئیں۔ اور پھر سے عمو جان بھی بیٹے کی ناں کے پورے حامی تھے، یوں انکار بھجوا دیا گیا۔

؎ بربادیٔ دل فیض جبر نہیں ہے کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

رات روشانے کو بستر پر سڑ سڑ کرتے دیکھ کر میں نے اس کی بغل سے تکیہ کھینچا تو وہ تکیے کے ساتھ خود بھی کھنچتی چلی آئی۔ اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"اسے رے سد وشی! کیا سچ مچ تجھے اس جرنلسٹ کے بچے سے محبت ہو گئی ہے"۔

"کیا بکواس ہے یہ"۔ وہ میری بات پر خود ہی سمٹ کر مجھے دھکیلنے لگی۔

مشہور و معروف افسانہ و ناول نگار
رفعت سراج
کے افسانوں کا مجموعہ
کستوری
کا دوسرا ایڈیشن
شائع ہو گیا ہے
قیمت 75/- روپے
سول ایجنٹ
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی

"تو پھر یہ برسات؟"

"پتا نہیں۔ پتا نہیں وشی! مجھے کیا ہو گیا ہے؟"
اس نے اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر پلکیں جھکا دیں۔

مجھے یہ احمق لڑکی اس لمحے سخت قابلِ رحم لگی۔ اب میں اتنی کم فہم یا کم عمر نہ تھی کہ اس کی اس اضطرابی کیفیت کا بیک گراؤنڈ نہ سمجھ پاتی۔ مگر شاید روشانے تو خود سے بھی چھپاتی پھر رہی تھی۔

"ستیاناس ہو تمہارا بلال احمد! تم نے تو میری اچھی خاصی عقل مند، ذی ہوش روشانے کا ناس مار دیا۔" میں نے روشانے کو گلے لگا لیا۔ ذرا سی ہمدردی پاتے ہی اس کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔

میں سوچ رہی تھی، طیبی اپیا، بلال احمد نے بہت جلدی کر ڈالی۔ میں اس بھائی کی کم عقلی پر ماتم کرتی رہ گئی۔ رات سونے سے پہلے اس نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں آمنہ، مہرو یا ربیعہ میں سے کسی کو بھی ہوا نہ لگنے دوں۔

"یہی کہ بدھو سی روشے کو خطرناک عشق ہو گیا ہے۔"
اور جواباً اسی نے میرے منہ پر اپنا موٹا تازہ تکیہ دے مارا۔

بلال احمد کی طرف سے اس انکار کے بعد مکمل خاموشی طاری تھی۔ طیبی اپیو بھی اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ یوں بھی وہ جانتی تھیں کہ "جلال ہاؤس" کے مردوں کے فیصلے آخری اور اٹل ہوتے ہیں۔

ان ہی دنوں میرا چاند سا وارا لالہ ارباز خان ایبٹ آباد سے چلا آیا۔ اس خوشخبری کے ساتھ کہ وہ میجر ہو گیا ہے۔

امی تو بیٹے کو دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ ادھر آمنہ بچاری اپنی خوشی چھپاتی پھر رہی تھی۔ وہ ہم سب کی طرح ارباز خان کی آمد پر دھمال نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس کے نام کی انگوٹھی نے اسے اس آزادی سے محروم کر دیا تھا۔

ارباز لالہ کی آمد نے جلال ہاؤس میں رونق بھر دی تھی۔ وہیں سبریز لالہ کے چہرے کی بھی رونق دوبالا تھی۔ ان دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اب سارا سارا دن دونوں گھر سے غائب رہتے۔ رات کو آتے تو کمرے میں بند ہو جاتے۔ باہر نکلتے تو لیلیٰ مجنوں۔ نہ صرف ان دونوں کا دل ملتا تھا۔ بلکہ شکل بھی بہت ملتی تھی بس آنکھوں کی رنگت میں فرق تھا۔ سبریز خان کی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں، جبکہ ارباز لالہ کی میری ہم رنگ یعنی سنہری تھیں، باقی ان کا ڈیل ڈول انداز۔ اس پر دونوں کا ہیر اسٹائل بھی یکساں تھا۔ ہاں فرق یہ تھا کہ ارباز لالہ ہنس مکھ اور نرم خو تھے جبکہ سبریز خان گرم مزاج تند خو اور کم گو، مگر باوجود مزاج کے اتنے فرق کے ان دونوں کی دوستی خاندان بھر میں مشہور تھی۔

ارباز لالہ کی آمد پر ان کی شادی کا غلغلہ مچا۔ سب زور دینے لگے کہ اب آ ہی گئے ہو تو پانچ سالہ منگنی کو اب مضبوط بندھن میں بندھوا کر جاؤ۔

اندھے کو کیا چاہیے۔ دو آنکھیں، انہوں نے دزدیدہ نظروں سے آمنہ کو دیکھتے ہوئے جھٹ سے رضامندی دے دی۔ آمنہ بچاری کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ عین ڈنر کی میز پر یہ معاملات طے ہوں گے اور ارباز خان جی دار تو تھا ہی مگر اتنا اندازہ نہیں تھا کہ یوں منہ پھاڑ کر اقرار کر دے گا بلکہ یہ بھی کہ۔

"بالکل۔ اب میں بھی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"
اس نے کتنے اطمینان سے کہتے ہوئے آمنہ کا اطمینان غارت کیا تھا۔ وہ مشرقی ہیروئن جھپاک سے آنچل میں لال چہرہ چھپا کر ڈائننگ روم سے جادوئی دھوئیں کی طرح گم ہو گئی۔ اس کے پیچھے ہم سب کی دبی دبی ہنسی بکھر گئی۔ مگر چند لمحات کے بعد میری ہنسی یوں بند ہو گئی جیسے کسی نے آبشار پر شٹر گرا دیا ہو۔

عمو جان کہہ رہے تھے۔
"ارباز کے ولیمے کے روز سبریز اور بلوشہ کی منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"
انہوں نے ارباز سے بات کرتے کرتے سبریز کی طرف پُرخیال نظروں سے دیکھا، یہ ایک دھماکہ تھا میرے لیے۔

میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ میں آمنہ کی طرح شرمائی تھی نہ گھبرائی تھی، بلکہ حیران ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ یہ میرے لیے ایک غیر متوقع دھماکہ تھا۔ جس نے میرے اعصاب کو سُن کر دیا تھا۔ میں بدقت خود کو سنبھال کر باہر آئی تو آمنہ نے مجھے گھیر لیا۔

"اب بولو یہ تل تل کیسے بند ہو گئی۔ اپنی باری آئی تو محترمہ نکل بھاگیں۔" اس کی آواز میں شرارت تھی۔

میں اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی پھر دہیں قریبی صوفے پر ڈھے گئی۔

"آمنہ یہ، یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ہائیں کیا مطلب؟" آمنہ نے گھوم کر مجھے اچنبھے سے دیکھا۔

"ممکن سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا سبریز لالہ کے سینگ ہیں یا تم انسان نہیں ہو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص مجھ سے اس قدر خائف رہتا ہو۔ بلاوجہ، بلا قصور، اپنے عتاب کا نشانہ بنائے رکھتا ہو، اسی سے شادی۔

میرے اعصاب کو توڑنے کا اصل محرک تو سبریز خان کی وہ خاموشی تھی جو رضامندی سے تعبیر کی جا رہی تھی۔

"احمق اعظم! سبریز لالہ تو ہیرا ہیں، خوش نصیب ہے تو۔"

"شٹ اپ۔" میں غصے سے کھڑی ہو گئی۔ "تم لوگ کیا جانتی نہیں ہو کہ وہ مجھ سے کس قدر ناراض رہتے ہیں۔ کتنا چڑتے ہیں وہ میری حرکتوں پر، بھڑ بھڑ پر۔"

"مگر سوچو ذرا۔ کہ وہ تم سے شادی پر بخوشی راضی ہیں۔ یہ کوئی زبردستی نہیں ہو رہی ان کے ساتھ۔"

آمنہ جانے کیا کچھ کہتی رہی مگر میں ——— زلزلوں کی زد میں تھی کہ مجھے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

علینہ آپو کی شادی کے دو ہفتوں بعد ہی ارباز لالہ اور آمنہ کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ ساتھ میری اور سبریز خان کی منگنی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا لوں۔ کھل کر رو دوں اور بہت رو دوں۔ مگر اس طرح رونے اور واویلا مچانے کا ہر کوئی جواز پوچھتا اور بھلا جواز کیا تھا میرے پاس خوبصورت مہذب اونچے خاندان کا لائق فائق لڑکا جس میں شاید ہی کوئی کمی رہ گئی ہو (خاندان والوں کی نظر میں) اسے میں کس جواز پر ریجیکٹ کر دوں۔

میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں حقیقت میں خوش ہوں یا ناخوش۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خوشیوں کے ڈھیر پر مجھے بٹھا کر میرے ہاتھ میں انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

میں اپی کے کمرے سے تازہ تازہ ڈانٹ کھا کر نکلی تھی، میں نے صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ۔

"ابھی صرف ارباز لالہ کی شادی کا سوچیں، میری منگنی کی اتنی جلدی کیا ہے؟" اور جواباً اتنا کچھ سننے کو ملا کہ خدا کی پناہ۔ ارباز لالہ الگ خفا ہوئے۔

میں رات ارباز لالہ کو دودھ دے کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی کہ سبریز خان کی پکار پر ٹھٹک گئی، وہ اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے تھے، مجھے دیکھ کر نکلے تھے یا پہلے سے موجود تھے۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا، مگر بہرحال عجیب تحکم بھرا لہجہ تھا۔ میں ناچار رک گئی۔ مگر رخ موڑے کھڑی رہی۔ جیسے ذرا سا اشارہ ملے کہ "کچھ نہیں جاؤ" اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ جاؤں۔ مگر راہ میں وہ ایسے دریا کی طرح کھڑے ہو گئے ——— کہ جسے پار کرنا مشکل تھا۔

"ابھی تک جاگ رہی ہو۔" انہوں نے اپنی کلائی میں بندھی سنہری رسٹ واچ پر نظر ڈال پھر مجھے دیکھا۔

"ارباز لالہ کو دودھ دینا بھول گئی تھی۔ شکر ہے وہ جاگ رہے تھے۔" میں نے کوشش کی ان کی طرف نہ دیکھوں۔ مگر یوں دیوار کی طرف دیکھتے رہ کر بات کرنا عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ ذرا سی توجہ اس طرف کی تو گویا میرا دل سینے کی دیواروں میں پھڑپھڑانے لگا۔

سبز آنکھوں کے طلسم نے جیسے مجھے اچانک جکڑ لیا۔ پتا نہیں یہ میرے آج اتنے نامانوس کیوں محسوس ہوئے۔ وہ اپنے بے تحاشا سرخ ہونٹوں کو دانتوں کے گوشے میں دبائے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے اندر تک جھانک رہے ہوں۔ یکلخت میری پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ اتر آیا۔ میری پلکوں پر منوں بوجھ پڑ گیا۔

"اندر آؤ ذرا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گئے جیسے یہ یقین ہی تو تھا کہ حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہو گی، اور ہوا بھی یہی۔ میں دل میں اضطراب سمیٹے اندر چلی آئی، کمرہ روشنی میں نہایا گیا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، مگر میرے اندر اتنا شور تھا کہ میں بولائی جا رہی تھی۔

"ایک کپ چائے مل جائے گی؟" چند لمحوں کی دبیز خاموشی کو ان کی بھاری آواز نے توڑا تھا۔ میں نے بے اختیار سر اٹھایا۔

"جی۔!" میرے منہ سے پھسلا اور ان کے لبوں کی تراش میں مدہم مسکراہٹ لہرا گئی۔ اور مجھے لگا جیسے ہر شے الوہی روشنی میں نہا گئی ہو۔

"ہاں، اسٹرونگ سا ایک کپ۔" ان کا انداز ہنوز تھا۔

"جی۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" میں سر جھکا کر باہر نکل آئی۔ یہ چائے مانگنے کا کون سا طریقہ تھا بھلا۔ اندر بلانا، کچھ دیر خاموش نظروں سے جانچنا پھر کھٹ سے، "چائے" مانگنا مجھے جانے کیوں غصہ آنے لگا۔

شاید لاشعوری طور پر میری سماعتیں کچھ اور سننے کی متمنی تھیں۔

میرا دل جس اندیشے سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

نہ کوئی نرم پھوار جیسا جملہ۔ نہ کوئی دل کے تاروں کو چھیڑتی نگاہ۔

اس لمحے مجھے لفظ۔ "چائے" اتنا بے سُرا لگا کہ دل چاہا چائے کے بجائے گرم کھولتا ہوا پانی دے دوں بس۔ مگر سعادت مندی کے ساتھ چائے بنا کر ان کے کمرے میں آئی تو وہ کرسی پر بیٹھے کوئی میگزین دیکھ رہے تھے۔ میں نے چپ چاپ کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"بیٹھو۔!" میرے پلٹتے قدموں سے پہلے ہی حکم صادر ہوا میں نے پوری آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی۔ جی۔"

مگر دوسرے پل پلکوں کی جھالریں لرز کر جھک گئیں۔ میں ان کے سامنے کرسی پر مجرمانہ انداز میں ٹک گئی۔

"اس رشتے میں تمہاری رضامندی شامل ہے؟"

چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے وہ مجھے دیکھ بھی رہے تھے۔ میں اس سوال کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ بھی شاید ہر بات کھٹ سے کہہ دینے کے عادی تھے۔ ان کے لہجے میں مخصوص ٹھہراؤ تھا اور ہلکی سی سرد مہری بھی۔

"میں اس معاملے میں بالکل بے اختیار ہوں۔" میری آواز پست تھی۔ جانے کیوں ان کی آنکھوں کے ہیرے چمک اٹھے۔

"ہاں لڑکیوں کو زیادہ اختیار دے دیے جائیں تو پورے خاندان کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔" وہ لمحہ بھر رُکے۔

"تمہارے لیے اس معاملے میں یہ بے اختیاری اذیت ناک ہے یا بے ضرر؟" ان کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر تعجب سے دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیا پوچھنا چاہتے تھے۔

"اگر تمہیں اختیار دیا جائے تو تمہارا فیصلہ کیا ہوگا انکار یا اقرار؟"

"یہ بات آپ صرف جانچنے کے لیے کر رہے ہیں یا میرے انکار، اقرار کو کوئی ویلیو دی جائے گی۔ میرا مطلب ہے میرے فیصلے کو؟"

میں نے کہا تو انہیں شاید میرا جواب خاصا غیر متوقع لگا تھا۔ ایک دو پل مجھے بغور دیکھتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگے۔

"خاصی سمجھدار ہو گئی ہو۔ میں تو اب تک تمہیں ویسی ہی احمق لڑکی خیال کر رہا تھا۔"

یہ تعریف کا انداز تھا یا تضحیک کا بہرحال میرا دل بُرا سا ہونے لگا۔

"تو اسی لیے آپ مجھے اپنا رہے ہیں احمق سمجھ کر؟" میں کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگے۔

"میں تمہیں اپنا تو نہیں رہا۔"

"جی۔ جی۔" میں ہکا بکا رہ گئی۔ "تو۔ تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ کا اقرار، آپ کی خاموشی؟"

وہ اٹھ کر میرے مقابل آ گئے اور بڑی سرد سی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کیا خاموشی کا مطلب ایک ہی ہو سکتا ہے؟"

میں دو قدم پیچھے ہٹی۔ مجھے اپنے رخسار گرم گرم محسوس ہونے لگے، لہو میں کھولن ہونے لگی۔

"اگر آپ ناخوش ہیں تو انکار کر دیں۔ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" میں باوجود ضبط کے سلگتی لکڑی کی طرح چٹخ گئی۔

"پلوشہ صاحبہ! تمہیں کس نے کہا کہ میں ناخوش ہوں؟"

"اُف!" مجھے لگ رہا تھا، جیسے مجھے کسی نے جلتے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔ میں نے الجھ کر ان کی طرف

دیکھا۔ ہتک کے احساس سے میرا رواں رواں سلگنے لگا۔

"اگر یہ مذاق ہے تو انتہائی بھونڈا ہے سبریز خان اور اگر تذلیل کی کوشش ہے تو۔" میری آواز بھرا گئی۔

انہوں نے لپک کر میری کلائی پکڑلی ورنہ میں کمرے سے نکل چکی ہوتی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔ چھوڑیں نا۔" مجھے اب ایک پل ٹھہرنا دوبھر ہو گیا تھا۔

"بات کو تم ہی کہاں سے کہاں لے گئیں، میں نے تو صرف ایک سوال پوچھا تھا کہ تم اس رشتے پر راضی ہو یا نہیں۔"

"کون ہوتے ہیں آپ یہ مجھ سے پوچھنے والے۔ بیٹھے ہیں میرے ماں باپ، پوچھ لیجیے گا ان سے۔"

میں ان کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے لگی مگر گرفت اتنی سخت تھی کہ میری آنکھوں میں تکلیف سے نمی اتر آئی۔ وہ شاید میری بے بسی کا یہ تماشا دیکھ کر لطف اٹھا رہے تھے۔

"میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں جیسے آپ۔ کیا سمجھتے ہیں خود کو۔" میں نے تلملا کر ان کے ہاتھ پر دانت گاڑ دیے۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور میں نے موقع پاتے ہی کمرے سے دوڑ لگا دی۔ اپنے بیڈ پر گر کر میں بلک اٹھی۔

"بدتمیز، جنگلی، ظالم۔" میں باآواز بلند انہیں گالیاں دینے لگی۔ شکر تھا روشانے گہری نیند میں تھی ورنہ اپنے بھائی کی شان میں مجھے قصیدہ پڑھتے دیکھ کر بلی کی طرح جھپٹتی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کا بھائی جنگلی جانور ہی نہیں بلکہ ذہنی مریض بھی ہے۔ ہاں ذہنی مریض، کمزور پر رعب ڈال کر اپنی انانیت کی تسکین کرتا ہے۔

نہیں آؤں گی اب میں ان کے کسی بھی رعب میں۔ پتا نہیں عموجان کی تربیت میں کہاں کوتاہی رہ گئی ہے۔ مجھے سچ مچ سبریز خان کی ذہنی حالت سے خوف آنے لگا تھا۔

رات بھر رونے اور جاگنے کے باعث صبح سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھیں الگ متورم ہو رہی تھیں، سب ہی نے فرداً فرداً پوچھا مگر سر درد کا بہانہ کر کے ٹال گئی۔

"ارے سبریز! یہ کیسا نشان ہے؟" لنچ پر اچانک چچی کی نظر ان کے ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ میری نظریں بھی بے اختیار اس جانب اٹھیں۔ جہاں سنہری روؤں کے بیچ ہلکی سرخی اور سوجن نمایاں تھی۔

"کسی کیڑے نے شاید رات کاٹ لیا تھا۔" انہوں نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔ میرا دل سینے میں بے ترتیب سا ہو گیا۔

"کیڑے نے۔ تمہارے کمرے میں کیڑا کہاں سے آ گیا؟" چچی کو فکر لاحق ہو گئی۔

"کوئی مسئلہ درد نہیں ہے؟" چچی جان نے۔

"جی ہاں، انہیں کاٹ کر تو شاید وہی زخمی ہو گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے دانت ہی ٹوٹ گئے ہوں بیچارے کے۔" ارباز لالہ شرارت سے کہہ کر ہنس پڑے۔ ٹیبل پر قہقہے امڈ پڑے، میرا منہ لال ہو گیا۔ نظریں اپنی پلیٹ پر گڑ گئیں۔ میں نے محسوس کیا ان کی زمردیں آنکھیں میرے جھکے سر پر اٹھیں پھر پلٹ گئیں۔ وہ جب تک ٹیبل پر موجود رہے میں نوالے سے کھیلتی رہی۔

شام بڑی بوجھل تھی یا مجھے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ سبریز خان اور میری اپنی پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔

میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ شاید خوش فہمیوں کا وہ جال جو لاشعوری میرا دل بنتا چلا رہا تھا۔

میں لان میں پیپل کے درخت کے نیچے اپنے مخصوص گوشے میں آ کر بیٹھ گئی۔ قریب ہی گیندے کے پھولوں کی کیاری تھی۔ جو اب سردیاں گزر جانے کے بعد بڑی بے رونق دکھائی دے رہی تھی۔ زرد زرد پتیاں مٹی میں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔

"بلوشے! کیا بات ہے، یہاں اکیلے کیوں بیٹھی ہو؟" عموجان کے ہاتھ کا لمس مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔ وہ شاید خاصی دیر سے یہاں کھڑے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے، بلکہ میرے تو رخسار بھی نم نم تھے۔

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

"بس یونہی عموجان!" میں نے دوپٹے کا کنارا اٹھا کر چہرا پونچھا۔

"تم تو بہت زندہ دل، چنچل بچی ہو، تنہا بیٹھنا تمہارا مزاج تو نہیں ہے پھر یہ۔"

"کبھی کبھی اچھا لگتا ہے خاموش اور اکیلے بیٹھنا۔" میں بے مقصد مسکرانے کی کوشش کرنے لگی، مگر میری یہ خالی خالی مسکراہٹ میرے اضمحلال کی گواہ بن گئی۔

"تم خوش نہیں ہو کیا سبریز سے شادی کرنے پر؟" عموجان نے اپنا شفقت سے نحیف ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تو گویا میں پگھل پگھل گئی، میرا دل زور و شور سے رونے کو چاہا۔

"ڈر لگتا ہے تمہیں اس سے؟" انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔

"نہیں بلوشہ بیٹی! وہ اندر سے ایسا نہیں ہے۔ تم اسے نہیں جانتیں۔" جتنا میں ان سے رسے "عموجان" سے بے اختیار لپٹ گئی، وہ حیران ششدر رہ گئے۔

میرا یوں زار زار رونا ان کے لیے یقیناً استعجاب کا باعث تھا۔

میری تو ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کچھ بولنا چاہتی تو آنکھوں کی زبان آنسو اگلنے لگتی۔

"یہ اتنا بہت سارا رونا کیوں بیٹا؟" عموجان مجھے تھپک کر حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ میں ان سے الگ ہو گئی۔ اور برستی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

(یہ عموجان واقعی انجان تھے یا بن رہے تھے۔)

میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"یہ زبردستی کے تعلق پائیدار نہیں ہوتے عموجان! یکطرفہ جذبے اس تعلق کے بوجھ کو زیادہ عرصے نہیں اٹھا سکتے۔"

میں نے چہرہ جھکا لیا۔ عموجان نے بے حد چونک کر میری طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں حیرت جھلکی پھر وہ اسی کیفیت میں بولے۔

"کیا سبریز نے تم سے کچھ کہا ہے؟ میرا مطلب ہے انکار کیا ہے یا انکار کرنے کو کہا ہے؟" میں گڑبڑا گئی۔

"نن۔ نہیں تو زبان سے تو نہیں کہا۔" میں نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں پھر آنکھوں کے گوشے آنسوؤں کے قطروں سے جاری ہو گئے۔

"ناپسندیدگی کے اظہار کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں عموجان! کیا آپ نہیں جانتے یا جان کر انجان بن رہے ہیں۔ سبریز مجھے ہمیشہ سے ناپسند کرتے آئے ہیں۔ یہ بات "جلال ہاؤس" کا ہر فرد جانتا ہے کہ ہمیشہ میں ہی ان کے عتاب کا نشانہ بنی ہوں۔ خطا جس کی بھی ہو، سزاوار میں ٹھہری ہوں۔ ان کی نظر میں کیا یہ نفرت ناپسندیدگی کا کھلا اظہار نہیں ہے۔"

میرا ضبط جواب دے گیا۔

عموجان گنگ سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

"میں طینی آپو کی طرح باغی نہیں ہوں عموجان! نہ میں آپ کے فیصلے سے روگردانی کر رہی ہوں۔ میں تو بس آپ کو وہ رخ بھی دکھانا چاہتی ہوں، جسے دیکھ کر آپ خود فیصلہ کیجیے گا۔ میں نے آپ کی محبت پر کبھی شک نہیں کیا عموجان! مجھے آپ کی عزت، آپ کی رضا اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔" میں نے ان کی گود میں سر ڈال دیا۔

"میں گستاخ بھی نہیں ہوں عموجان!"

"پاگل!" عموجان میرا سر تھپکنے لگے ان کے لہجے میں پیار بھری مسکراہٹ گھل گئی۔

"اگر میں کہوں کہ وہ تم سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرتا ہے، تو کیا تم یقین کرو گی؟"

میرے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر گئی۔

"پاگل! وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا، اس میں اب ہمت نہیں تھی اپنی چیز، اپنی متاعِ حیات کھو دینے کی۔ تمہارے گرد یہ دائرہ نفرت میں نہیں، محبت میں تنگ کرتا جا رہا تھا۔ اور بے وقوف مطمئن ہے کہ تم اس تنگ حصار سے نہیں نکل سکو گی ـــــــ بس میں اسی بات سے، اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ بہت سمجھایا اس احمق کو۔ مگر بڑا ضدی ہو گیا ہے۔ شاید بار بار ٹوٹنے اور انا کے مجروح ہونے کی اذیت سے دوچار ہونے سے خوف زدہ ہے۔ بلوشہ بیٹا! تم نہیں جانتیں اُسے، مگر میں اس کا باپ ہوں، اس کے دل میں جھانک سکتا ہوں۔ اُس کے دکھ سکھ، اُس کے محسوسات میری نظروں میں ہیں۔ میں وہ سب محسوس کر سکتا ہوں جو تم نہیں کر سکتیں۔"

عموجان نے میری طرف دیکھا۔ میں خالی خالی نظروں

سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے بے حد پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکا۔

"میں سمجھتا ہوں اس نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے بہت غلط کیا ہے، مگر یوں سمجھو بلو شہ بیٹی کہ ہر انسان کے اندر ایک معصوم خوف زدہ ننھا سا بچہ ہوتا ہے جو بہت سے واہموں میں گھرا ہوتا ہے اور من مانی کرتا ہے، ہمکتا رہتا ہے، ایسے میں بہ کبھی فائدہ اور کبھی نقصان اٹھاتا ہے۔"

"عمو جان!" میں نے کچھ کہنا چاہا، مگر آواز حلق میں پھنس گئی میں نے ان کے لرزتے ٹھنڈے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے، اور چہرے پر ایک حزن سمٹ آیا تھا۔ انہوں نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

"سبز بز نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ بہت دھوکا کھایا ہے۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ بلا کا ہنس مکھ نا زندہ دل اور محبت کرنے والا تھا۔ مگر اس نے اپنی محبتوں کے لعل و گوہر ایک ایسی لڑکی کے دامن میں ڈال دیے، اپنی تمام تر مسکراہٹوں کے تحفے اس لڑکی کے دامن میں ڈال دیے، جسے سچے جذبوں کی قدر نہ تھی۔ وہ پل بھر میں مٹنے والے رنگوں کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی۔"

میں دھک سے رہ گئی۔ میرے لیے یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ عمو جان کہہ رہے تھے

"وہ لڑکی سلطانہ جہاں ہے۔ تمہاری طینی آپو تھی۔" میں تحیر آمیز بے یقینی سے عمو جان کو تکنے لگی۔ جو ماضی کی وہ کتاب اٹھا لائے تھے، جس پر وقت نے اتنی گرد مٹی دھول ڈال دی تھی۔ جو مجھے کبھی دکھائی نہ دیتی، مگر آج وہ ہولے ہولے اس گرد کو ہٹا رہے تھے، اور ورق ورق کھولتے جا رہے تھے۔

"سلطانہ جہاں کی پیدائش پر تائی اماں نے اسے اپنے لختِ جگر سبز بز کے لیے مانگ لیا۔ انہیں اپنی اکلوتی نند کی اکلوتی گڑیا جیسی بیٹی بے حد پسند تھی۔ پھپھو کو بھی بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ "جلال ہاؤس" ان کا میکہ ہی نہیں ایک تعلیم یافتہ مہذب گھرانہ تھا جہاں شائستگی اور محبت کی فضا رہتی تھی۔

جہاں رشتوں، ناتوں اور محبتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

چھوٹا سا سبز بز تو اس گڑیا کا دیوانہ تھا۔ خرم جمال (پھپھو کے شوہر) جب چھ ماہ کے لیے ملک سے باہر بزنس ٹور پر گئے تو پھپھو "جلال ہاؤس" میں ہی رہیں، اور سب نے سبز بز اور سلطانہ کی محبت دیکھی، وہاں بہت سارے بچے تھے۔ مگر سبز بز کو جانے کیوں چھوٹی چھوٹی پونی ٹیل بنانے والی سلطانہ ہی بھاتی تھی۔ وہ اسکول سے واپسی پر اپنے بستے میں ڈھیر ساری ٹافیاں لے کر آتا اور ساری کی ساری اس کی گود میں ڈال دیتا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھتی۔ باقی بچے منہ دیکھتے رہ جاتے، کچھ چھینا جھپٹی کرتے مگر سبز بز تو مرنے مارنے پر تل جاتا۔

"ماشاء اللہ بھابی جان! آپ کا سبز بز تو ابھی سے میری بیٹی کا دیوانہ ہے، پکا عاشق لگتا ہے۔" پھپھو بھی ہنس کر کہتیں۔

"خدا خیر کرے، جوان ہو کر تو جانے کیا کرے گا۔ قدموں میں چاند تارے ڈھیر کرنے کے لیے سچ مچ چاند پر نہ نکل جائے۔" چچی خانم کہتیں۔ اور جواباً تائی اماں اور پھپھو ہنس پڑتیں۔

وقت کے کشکول میں لمحے بڑے تیزی سے گر رہے تھے۔

طینی نے میٹرک کیا تو کو ایجوکیشن کالج میں ایڈمیشن لینا چاہا، مگر پھپھو پریشان ہو گئیں۔

"میری ساری فرینڈز جس کالج میں ایڈمیشن لیں گی، ظاہر ہے میں بھی وہیں جاؤں گی۔ ممی آپ تو بہت ایڈوانس ہیں پھر یہ۔۔"

"بات میری پسند ناپسند کی نہیں ہے جانم! تمہارے بڑے ماموں پسند نہیں کریں گے دیکھتی نہیں ہو جلال ہاؤس کی کوئی لڑکی بھی۔"

"مگر میں "جلال ہاؤس" کی فرد نہیں ہوں۔" وہ پھپھو کی بات کاٹ کر بولی۔ "مجھے صرف آپ کی پرمیشن چاہیے۔ یوں بھی کو ایجوکیشن میں پڑھنے سے بندہ با اعتماد ہو جاتا ہے ماما!" اس نے گویا دلیل پیش کی قائل کرنے کے لیے۔

"نہ بھئی نا۔ پہلے ہی تمہاری ہر ضد پوری کرتی رہی

ہوں، اس پر اصرار نہ کرنا مجھ سے، میں اپنے لالہ کو ہرگز خفا نہیں کر سکتی۔" وہ جاتی بنیں۔ سلطانہ جہاں منہ پھلا کر جلال ہاؤس چلی آئی۔

اپنی کالج فائل میں الجھا ہوا سبریز اندر داخل ہوتی سلطانہ جہاں کو دیکھ کر اپنی ساری تھکن جیسے بھول گیا۔

"زہے نصیب، امزاج خراب لگتے ہیں دشمنوں کے۔" اس نے سلطانہ کے چہرے کے بگڑے زاویے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا۔

"کہیں تو آگ لگی ہے، یہ دھواں بتاتا ہے۔" وہ ہنس دی اور گھاس پر اس کے برابر دھپ سے بیٹھ گئی۔ سبریز جھجک کر ذرا دور ہو گیا۔

"خیریت ہے۔"

"سبریز! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"فرمائیے، کیا مدد کر سکتا ہوں۔" اس کی سبز آنکھوں کے تیر سے لو دینے لگے تھے۔

اس نے اطمینان سے اپنا مدعا بیان کیا۔ ایک پل کو تو سبریز بھی چکرا گیا۔ اسے ناگوار گزرا، مگر وہ تو ہچکیوں رونے لگی تھی۔

"میرا پورا گروپ چھٹ جائے گا، میں ایجوکیشن جاری نہیں رکھ سکوں گی، میں پھر ہرگز ہرگز کالج میں ایڈمیشن نہیں لوں گی۔"

اس کے آنسو سبریز خان کے دل پر گر رہے تھے، اس کی ہمدردی اور محبت کے تمام تار جھنجھنا اٹھے، وہ اس کے آنسوؤں میں بہہ گیا۔

"کم آن طبیعی! اس سیلاب پر تو بند باندھو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے تسلی دی۔ وہ کھل اٹھی پھر اسی رات سلطانہ نے پھپھو کو تو راضی کر لیا۔ مگر جلال ہاؤس میں سب نے اس کی سخت مخالفت کی۔

جب اتنے اچھے گرلز کالجز ہیں تو کیا ضرورت ہے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کی۔"

"کوئی حرج نہیں ہوتا، سال دو سال کی تو بات ہے۔" سبریز نے سب کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ محض اپنی چاہت کے لیے۔

"میں تمہیں بھی کہتا ہوں سبریز! یہ اتنی آزادی جو تہنیت نے دے رکھی ہے، کیا وہ کافی نہیں ہے،

جواب تم بھی اس کا ساتھ دے رہے ہو۔ دیکھ لینا ایک دن سر پکڑ کر روؤ گے۔"

نبیل لالا بری طرح برہم ہو رہے تھے، اس نے کندھے اچکا دیے۔

"آپ سبھوں کی اتنی دعائیں ساتھ ہوں گی تو بھلا میں کیوں روؤں گا۔"

سلطانہ جہاں تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ مگر اس کی خواہشات کا دریا بہت رواں تھا۔ اس میں بے حد تندی اور روانی تھی۔ سبریز خان کو کبھی کبھی اپنے ضبط کی ناؤ ڈوبتی نظر آتی۔ وہ نہ صرف کو ایجوکیشن میں پڑھ رہی تھی، بلکہ اس کا پورا گروپ ہی لڑکوں پر مشتمل تھا، اور ان کے ساتھ عموماً کالج سے ہٹ کر بھی گھومنا پھرنا رہتا تھا۔

ایک بار سبریز نے اسے آئس کریم پارلر سے ایک لڑکے کے ساتھ نکلتے دیکھ لیا، اور رات اس کے یہاں جا کر سرزنش کی۔

"تو اس میں کیا ہوا، راحیل میرا بہت اچھا دوست ہے، یہ سارے میرے فرینڈز ہیں۔"

"یہ مغربی معاشرہ نہیں ہے سلطانہ جہاں۔ یہ مسلم کنٹری ہے، اور تم مسلمان ہو، ہمارے یہاں کسی بھی صورت غیر مردوں سے فرینڈز شپ جائز نہیں ہے، اور نہ میں ذاتی طور پر یہ بات پسند کرتا ہوں، نہ ہمارے خاندان کی ریت روایت یہ رہی ہے۔"

"ہا! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور تم وہی خاندانی روایتوں کی پاسداری میں دھکے ہوئے ہو۔ میں کم از کم ان باتوں کو معیوب نہیں سمجھتی۔ یوں بھی مجھ پر ایسی کوئی بھی پابندی میرے گھر والوں کی طرف سے عائد نہیں ہے، پاپا نے آج تک مجھ سے باز پرس نہیں کی۔" اس کا انداز جتانے والا بے حد کڑوا تھا۔

سبریز خان کا چہرا اس کھلی انسلٹ پر لال ہو گیا۔

"زمانہ تنزلی کی طرف رواں ہے، جسے ہم ترقی کہہ رہے ہیں۔ سلطانہ صاحبہ وہ کہاں سے کہاں نہیں پہنچا بلکہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور ہم آنکھیں بند کیے بڑے خوبصورت خواب دیکھ رہے ہیں، ترقی یافتہ کہلوانے کے۔ آئی ایم سوری سلطانہ بی۔ خاندان کی اگر

اچھی اور تہذیب یافتہ روایتیں ہیں تو ان کی پاسداری کرنا میں حماقت نہیں بلکہ فخر سمجھتا ہوں، اور رہی تمہارے پاپا کی بات تو ضروری نہیں کہ انہوں نے جس بات کی باز پرس نہ کی ہو۔ میں بھی نہ کروں، ان سے کا میرا تعلق تم سے مختلف ہے، وہ باپ ہیں تمہارے اور میں "

"بچپن کا منگیتر۔ یہی نا" وہ اس کی بات کاٹ کر کرسی پر جا گری۔

ایک لمحے کو سبزر اس کے کہہ دینے پر ششدر رہ گیا۔

"صرف منگیتر" اس نے بڑی گھائل نظریں اس پر ڈالیں، مگر وہ بے نیاز ہی رہی۔

"میری نظر میں اس منگنی کی ویلیو اتنی نہیں ہے طینی! جتنی اس محبت، اس چاہت کی زنجیر کی ہے جو تمہارے اور میرے مابین برسوں سے بندھی چلی آئی ہے۔"

اس کا لہجہ دھیما تھا۔ سلطانہ نے سر اٹھا کر بڑی تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے اس خوبصورت شخص کو دیکھا، وہ اگر حسن پرست ہوتی تو سبزر خان کو کبھی نہ ٹھکراتی۔

"تو اس زنجیر سے تم مجھے باندھنا چاہتے ہو۔ میری تمام تر آزادیاں سلب کرنا چاہتے ہو۔ تو سوری سبزر خان میں ایسی محبت کو نہیں مانتی۔ یہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ محبت کے نام پر عورت کو محض پابند کرنا ہے، مرد ہمیشہ سے یہ گیم کھیلتا آیا ہے اس طرح وہ عورت ذات کی، اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔"

"شٹ اپ طینی! " اس کی زبردست آنکھیں تو غصے اور دکھ سے سلگ اٹھیں، اس کا منہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"تم۔ اوف مائی گاڈ! ۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تمہاری سوچ اتنی سطحی ہو گی۔"

"میری سوچ سطحی نہیں ہے۔ بلکہ تمہاری محبت وہی روایتی ہے جو محبت کو شاعرانہ انداز میں لیتے ہیں۔ اور اسے خوشبو سمجھ کر صرف اپنے دل کے پھول میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ میں اسے محبت نہیں عورت کے حقوق کی موت کہتی ہوں۔"

سبزر کا دل چاہا، اس کا منہ طمانچوں سے سرخ کر دے۔ اس پر اپنا سارا ریوالور خالی کر دے۔ کتنی آسانی سے اس نے اس کی برسوں کی محبت کو پائمال کر دیا تھا۔ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

اس کا خون کھول رہا تھا۔ کنپٹیاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

دکھ اور صدمے نے اسے بالکل نیم جاں کر دیا۔ وہ تو اس نوبت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ سلطانہ جہاں اس کی سچی محبت کو اب تک ایک مذاق سمجھتی رہی ہے، اسے اپنے مفاد میں استعمال کرتی رہی ہے، اس کی جائز ناجائز ہر خواہش اس نے "جلال ہاؤس" کے ہر فرد کی مخالفت کے باوجود پوری کی تھی محض اس کی خوشی کی خاطر۔

اور آج وہ اسے روایتی مرد۔ خود غرض اور ظالم شخص سے تعبیر کر رہی تھی۔

کیا محبت دل میں اتنی گنجائش بھی پیدا نہیں کرتی کہ فریق ثانی کی خواہش کا احترام کیا جائے۔

مگر سلطانہ جہاں نے محبت ہی کب کی تھی شاید میں پاگل تھا کہ یکطرفہ سفر میں اتنی دور نکل آیا۔۔۔ اس کے نس نس میں دکھ گردش کرنے لگا۔ اسے لگا جیسے سلطانہ جہاں نے اس کے ہاتھ سے وہ گلدان لے کر توڑ دیا تھا۔ جسے وہ آج تک سنبھال سنبھال کر سینت سینت کر رکھتا آیا تھا۔

اس کا دل نفرت، غصے اور رنج کے سلگتے احساسات سے بھر گیا۔

اس کی زندہ دلی۔ اس کی مسکراہٹیں یوں گم ہو گئیں جیسے آکاس بیل ہری بھری بیل کا پتا پتا چوس لیتی ہے۔ ہاں سلطانہ جہاں کے زہریلے لفظوں نے کسی آکاس بیل کی طرح اس کے جذبوں کا پتا پتا چوس لیا تھا۔

تہنیت پھپھو نے غم و غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوش میں تو ہو تم؟ کیا کہہ رہی ہو۔ خبردار جو آئندہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔ میری آزادی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ طینی ورنہ"

"میں ایک زندہ اور جیتی جاگتی لڑکی ہوں ماما۔ میں یہ بچپن کی منگنیوں ونگنیوں کو نہیں مانتی، مجھے تو "جلال ہاؤس" میں عمر بھر رہنے کا سوچ کر ہی ہول آتا ہے۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا؟" پھپھو دھاڑیں۔

"کوئی دماغ خراب نہیں ہے میرا۔ وہاں کی حبس زدہ فضا میں رکھا ہی کیا ہے۔ اونہہ محبت، وفا، پیار یہ سب باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ بندہ پوری سوشل لائف تباہ کرکے چار دیواری میں قید ہو جائے مجھے تو وحشت ہوتی ہے کہ وہاں کی عورتوں کے دوپٹے مردوں کی موجودگی میں سروں سے ڈھلک نہیں پاتے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں دو دو گز کے لمبے دوپٹے اوڑھے پھرتی ہیں۔ ملازم مرد گھر کے اندر نہیں آ سکتے۔ عورتیں چادر کے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتیں۔ مردوں کے فیصلے آخری فیصلے سمجھے جاتے ہیں۔ امی یہ پابندیاں میں پسند نہیں کرتی۔ مجھے تو "جلال ہاؤس" کی فضا میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔"

"یہ جو تمہاری دانست میں خامیاں ہیں، یہ خامیاں نہیں خوبیاں ہیں جن پر ہر شریف انسان فخر کرتا ہے، یہی تہذیب ہے، یہی اعلا خاندان کی نشانی ہے۔"

"ہوں گی ـــ مگر میں اپنی زندگی نہیں برباد کر سکتی۔"

"پاگل مت بنو طینی۔ سبریز نہ صرف اعلا خاندان کا فرد ہے، بلکہ بہت ایجوکیٹڈ اور ذہین لڑکا ہے، اس کا مستقبل کتنا تابناک ہے۔ ذہین ہے، خوبصورت ہے، تم سے محبت کرتا ہے، کتنی احمق ہو تم جو ان چند معمولی بے کار باتوں کی وجہ سے اسے ٹھکرا رہی ہو، نہیں طینی جان!" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں ممّا! میں ابھی شادی ہی نہیں کرنا چاہتی، اور سبریز سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اندر سے وہی روایتی مرد ہے، اس کی سوچ بہت محدود ہے، یہ محبت، وحبت، سب بے کار چیز ہے ممّی! آپ خود سوچیں، ہمارا ماحول اور جلال ہاؤس کا ماحول۔ کتنا تضاد ہے، دونوں میں، کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی گھٹ گھٹ کر مر جائے، اپنی آزادیاں دیں آپ نے، اور اب جبکہ عمر بھر کا معاملہ ہے تو آپ وہی تنگ نظر روایتی ماں بن گئی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپ کر رو پڑی۔ پھپھو کا تو کلیجہ منہ کو آ گیا، ان کی نازوں پلی بیٹی کی آنکھوں میں یہ اتنے آنسو۔ ان کے دل پہ شعلوں کی طرح سے گرنے لگے۔ انہوں نے اسے خود سے لگا لیا۔

"چلو تمہارے پاپا آتے ہیں تو بات کرتی ہوں۔ مگر خیر وہ بھی تمہاری سوچ ہی رکھتے ہیں۔ ان سے کیا بات کروں گی۔" وہ بجھے بجھے انداز میں اس سے کہنے لگیں۔ "اچھا چلو آنسو پونچھ لو، جو تمہاری خوشی۔ ابھی تمہاری عمر ایسی کون سی نکلی جا رہی ہے۔"

سلطانہ جہاں کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فرطِ مسرت سے ماں سے لپٹ گئی۔ اور کمرے کے باہر کھڑے ممو جان کا بدن لرزنے لگا سو وہ تو بڑے مان سے سبریز کو لے کر آئے تھے کہ وہ خود سلطانہ جہاں کو سمجھائیں گے۔ ان کے خیال میں یہ وقتی جذباتی اور بچکانہ جھگڑے بڑے بے ضرر ہوتے ہیں، انہیں اسی وقت نمٹا لینا چاہیے، مگر یہ ان کی خوش فہمی ہی تھی۔ یہ کوئی جذباتی جھگڑا نہ تھا۔ یہ تو خالص نظریاتی اختلافات تھے۔ سلطانہ جہاں آزاد اڑنا چاہتی تھی، اور ان میں سے کوئی بھی اسے اس حد تک آزاد اڑنے کی اجازت دینے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

سبریز اسی وقت پلٹ کر نکل گیا تھا، ممو جان بھی بنا آہٹ کے آہستہ روی سے واپسی کے لیے قدم اٹھانے لگے۔

سلطانہ اور سبریز کی بچپن کی منگنی یوں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سبریز کی امی تو بستر سے جا لگیں۔ انہوں نے کب سوچا تھا کہ ان کی نند ایک بیٹی کی خواہش پہ اتنے دل اجاڑ دیں گی۔

سبریز خان کو بھی سنبھلنے میں کچھ وقت ضرور لگا۔ یوں بھی اس کے دل پر مرہم رکھنے میں خود سلطانہ جہاں کے انکار ہی کارگر ثابت ہوئے تھے۔ ان کے مابین کوئی تیسرا دیوار نہ بنا تھا، ان کی جدائی کسی

مجبوری سے وجود میں نہ آئی تھی۔ بلکہ خود سلطانہ جہاں نے تنفر سے اسے چھوڑا تھا۔ اور وہ تو مرد تھا اس کی انا پر پہلے ہی ضرب پڑی تھی، اس کی مردانگی پر کاری وار کیا گیا تھا، اسے تو سلطانہ جہاں کے نام سے بھی نفرت ہو گئی۔

"سبرینہ! میری ایک بات مانو گے؟" — امّاں اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے تھپکتے ہوئے بولیں، اس نے چونک کر ان کا زرد نحیف چہرا دیکھا، جہاں ایک طرح کی التجا تھی، اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں تمہاری منگنی کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بہت پیاری سعادت مند سی بچی کے ساتھ۔ بولو تو میری پسند پر اعتراض تو نہ کرو گے؟"

امّاں کے ساتھ عموجان نے بھی اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھا۔ جہاں عجیب سی یاسیت اتر آئی تھی۔

شادی تو بہر حال اسے کرنی تھی۔ اور وہ اس بے وفا لڑکی کا روگ لگانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"کون ہے بھلا وہ سعادت مند بچی؟" اس کا انداز تمسخر آمیز تھا۔ اس کے لبوں کی تراش میں طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"نبیل بھائی کی بیٹی بلوشہ۔"

"واٹ —" وہ یوں اچھلا جیسے اس کے سر بارودی سرنگ سے ٹکرا گئے ہوں۔ اس نے ماں کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کی ذہنی حالت پر شک ہوا ہو۔

وہ مسکرانے لگیں۔

"تو ابھی شادی کون کر رہا ہے۔ میں خاندان سے باہر کی لڑکی نہیں لانا چاہتی، کیا خبر اس کا مزاج کیسا ہو۔"

"مگر امّی۔ وہ بارہ سالہ بچی اور میں ستائیس سال کا مرد۔ آپ ہوش میں نہیں ہیں شاید۔ ابو یہ امّی کو کیا سوجھی!" اس نے بے چارگی سے ——— عموجان کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک سوجھی ہے، بلکہ یہ تو پہلے ہی سوجھ جانی چاہیے تھی۔ عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔ گھر، وفا، محبت اور ذہنی سوچوں کی ہم آہنگی سے بنتے اور بستے ہیں۔ عورت کے اندر لچک ہو، وفا ہو۔

سعادت مندی ہو تو گھر کو وہ جنت بنا دیتی ہے۔"

"مگر عموجان۔"

"میں مر جاؤں گی سبرینہ! میرا دل کٹ رہا ہے، تمہارا دکھ جھیلا نہیں جاتا مجھ سے۔ پتا نہیں تمہاری شادی دیکھنا میرے نصیب میں ہے یا نہیں۔ کم از کم یہ سوچ کر تو آسودہ ہو لوں کہ تمہارے نام ہے کوئی۔ اور میری اپنی پسند۔"

وہ رونے لگیں تو وہ بے بس ہو گیا۔

"ابھی تم شادی کرنا نہیں چاہتے۔ اور چند سال میں تو بلوشہ بھی بڑی ہو جائے گی۔"

اس نے کرب سے لبوں کو دانتوں میں دبا لیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔

"ایک شرط پر میں مانوں گا۔ اور آپ کو بھی ماننا ہو گی یہ شرط۔ بلکہ اس پورے گھر کو اس لیے کہ میں کوئی بے جان کھلونا نہیں ہوں، جس سے ہر کوئی اپنی مرضی اور منشا سے کھیلتا رہے۔"

"ہاں کہو۔" عموجان نے تحمل سے کہا۔

"بلوشہ اس گھر میں آج سے اس طرح رہے گی جس طرح میں چاہوں گا۔"

"کیا — کیا مطلب؟" — امّاں نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ جبکہ عموجان نے سر جھکا لیا تھا۔

ایک پل کرب سے آنکھیں بھی میچ لی تھیں۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ ان کا دل دکھ کی اتھاہ میں ڈوب گیا۔

"میرے پاس اب محبت نہیں رہی امّی! میں ایک خالی انسان ہوں، اس لیے مجھ سے کبھی یہ تقاضا مت کیجیے گا کہ میں بلوشہ کو محبت دوں۔ اس کی کسی بھی خواہش کو رعایت دینے کو میں ہرگز تیار نہیں ہوں، اسے اس گھر میں اسی طرح رہنا ہو گا، جس طرح میں چاہوں گا۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

تائی امّاں نے الجھ کر عموجان کو دیکھا۔ انہوں نے بے حد نرمی سے ان کے ہاتھ پر اپنا تسلی آمیز ہاتھ رکھ دیا۔

"جہانگیر! میرا بیٹا بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اسے کیسے سمیٹوں، کتنی محبت کی اس نے طیبہ سے، اسے کانچ کی گڑیا سمجھتا رہا۔ اس کی جائز، ناجائز خواہش

کو پورا کیا۔ مگر اس بدبخت نے کیا صلہ دیا۔ اچھا ہی ہوا اُس نے اپنی اصلیت دکھا دی۔ جہانگیر! میرا فیصلہ درست ہے نا۔ پلوشہ میری بچی بہت پیاری ہے نا؟" انہوں نے عمو جان کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

پلوشہ اور سبرینہ خان کی باقاعدہ منگنی کی رسم ادا نہ کی گئی تھی۔ چونکہ وہ ابھی نو عمر تھی، اور خود سبرینہ بھی تیار نہیں تھا۔ بس اندر ہی اندر بزرگوں کے درمیان بات طے ہو گئی تھی۔ پھر اپنی گزرتے روز و شب میں ایک دن سبرینہ کی اماں "جلال ہاؤس" والوں کو چھوڑ گئیں۔ یہ صدمہ تو بہت گہرا تھا، مگر وقت کے ساتھ یہ زخم بھی مندمل ہو گیا۔

مگر جو زخم سلطانہ جہاں نے لگایا تھا سبرینہ خان کے اندر بہت بڑی تبدیلی لے آیا تھا۔ وہ ایک جابر سخت گیر اور نفرت کرنے والا انسان نظر آنے لگا تھا۔ خاص کر اس کے پُرعتاب کا نشانہ پلوشہ ہوتی وہ تو جیسے اس کی ہر جائز خواہش کا بھی گلا گھونٹنے کو تیار رہتا تھا۔

اس کی ہنسی اس کی آنکھوں میں یوں چبھتی جیسے کسی نے انگارے ڈال دیے ہوں کانوں میں، اور خود سبرینہ خان کو دیکھ کر پلوشہ کی ہنسی کی برستی پھوار بھی یوں بند ہو جاتی، جیسے کسی نے برستی برسات پر شٹر گرا دیا ہو۔

سبرینہ خان اور میرے درمیان شروع سے ایک اجنبیت کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں اپنے دوسرے تمام کزنز سے فری تھی۔ شرارتیں بھی کرتی۔ مگر جہاں سبرینہ خان موجود ہوتا، جانے کیوں میری ساری زندہ دلی، خاص چلبلاہٹ دم توڑ دیتی۔ شاید یہ اس کی شخصیت کا خوف تھا یا پھر مجھ پر اٹھنے والی نگاہ میں ہی کچھ ایسی سہما دینے والی شعاعیں نکلتی تھیں۔

میں کبھی نہیں جان پائی تھی کہ اس کے پُرعتاب کا نشانہ فقط میں ہی کیوں رہی ہوں۔ میرے ہی گرد حصار کیوں تنگ رکھا گیا ہے، مگر آج۔ سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹ گئے تھے۔

سفاک حقیقتیں سامنے کھلی پڑی تھیں۔ عمو جان کی آنکھوں سے بے آواز بہتا پانی ان کے چہرے کو بھگو رہا تھا۔ بہت سے دکھ ان کی آنکھوں کے سامنے جاوداں ہو گئے تھے۔

میرے اندر کی ساری احتجاج کی لہریں دم توڑ چکی تھیں۔ میرا دل ایک نامانوس اتھاہ میں ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ اعصاب پر بڑا گھرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"تم میرے سبرینہ کو واپس لے آؤ گی نا وشی! اسے پھر سے ہنسنا سکھا دو۔ گی نا؟" عمو جان میرا چہرا ہاتھوں میں تھام کر یوں التجا کر رہے تھے، جیسے کوئی بچہ پسندیدہ کھلونا مانگ رہا ہو۔

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ بکھر گئی، جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"تمہاری تائی اس دن کا انتظار کرتے چلی گئیں۔ مجھے بھی اس دن کا کتنا انتظار تھا۔ میں ایک ایک لمحہ گنتا رہا ہوں۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے تم سبرینہ کی ماں کی سی نہیں، میری جیا لی تھی ہو بیٹا!"

میں نے عمو جان کے دونوں ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیے۔

"طبینی کی شادی ہو رہی ہے ناں، ہو سکتا ہے اس کے اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہو۔" عمو جان نے کہا تو میرے دل پر بڑے زور کا دھچکا لگا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت ان کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑ گئی۔

"تو کیا وہ اب بھی طبینی آپو کو۔" میں چپ ہو گئی، مجھے لگا میری آواز بکھر رہی ہے۔

"نہیں۔ نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ رہا۔" وہ لمحہ بھر چپ رہے پھر سر اٹھا کر بڑی محبت سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"ہو سکتا ہے بیٹا! بجھی ہوئی راکھ میں کوئی ننھی سی چنگاری رہ گئی ہو۔ اچھا ہے بجھ جائے گی وہ بھی۔ اگر ہوئی تو۔ مگر میرا نہیں خیال ایسا ہو۔ اسے تو اس لڑکی سے نفرت ہو چکی ہے۔"

مجھے لگا عمو جان میرے دل کو بہلا رہے ہوں۔

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا،
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

سبرینہ خان کی زندگی میں مسکراہٹیں لانے کا وعدہ تو ممو جان سے میں نے کر لیا تھا۔ مگر مجھے لگ رہا تھا، کہ خود میری ہنسی بھی چھن گئی ہو۔ میرا دل ہر وقت کے اضطراب میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی سبرینہ خان اتنا بے قصور دکھائی دیتے کہ دل چاہتا کہ انہیں سمیٹ لوں، اور کبھی ان پر شدید غصہ آتا۔

آخر سب بے قصور ہیں تو میرا قصور کیا ہے۔ مجھے کس بات کی سزا ملی ہے آج تک۔

سبرینہ کی یہ نفرت اور پھر اسی کے ساتھ تا عمر رہنا، اور یہ نفرت سہتے رہنا۔

خدایا۔ ممو جان مجھے کسی آزمائش میں ڈال رہے ہیں آپ۔

کاش طینی اپو! آپ نے یہ مصیبت کھڑی ہی نہ کی ہوتی، سب آپ کی وجہ سے ہے۔ صرف آپ کی وجہ سے، مجھے طینی اپو سے یکدم بے حد نفرت محسوس ہونے لگی، مگر دوسرے پل یہ نفرت پانی میں بنے بلبلے کی طرح پھوٹ گئی۔

ہر شخص کو اپنی زندگی گزارنے کا حق ہے۔

ہاں شاید، سوائے میرے۔ میری زندگی صرف سبرینہ خان گزاریں گے اور گزارتے رہیں گے۔

"ارے! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی مہرو کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے آخری کنارے پر قالین پر کسی بے جان چیز کی طرح پڑی تھی۔

"طینی اپو کی مہندی آئی ہے، یاد ہے تمہیں یا نہیں؟" وہ میرے کان میں گھس کر چلائی۔

"کیا مصیبت ہے، پتا ہے نہیں جانا مجھے؟" میرا جواب سن کر وہ یوں اچھل کر پیچھے ہٹی، جیسے میں نے اس کے پیر پر کاٹ ہی تو لیا ہو۔

"دماغ تو درست ہے تمہارا؟"

"اس میں دماغ خراب کی کیا بات ہے۔ ایک میرے نہ آنے سے کوئی آفت نہیں مچ جائے گی۔ مجھے نہ پا کر وہ لوگ واپس نہیں چلے جائیں گے۔" میں گویا پھنکار رہی تھی، وہ مجھے گھورنے لگی۔

"یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے آخر۔ روشانے بھی یہی کہہ رہی ہے کہ میرے نہ جانے سے کوئی مصیبت نہیں آ جائے گی۔ کیا مصیبت ہے منی اور رابی بھی نہیں جا رہیں۔" وہ باہر نکل گئی۔

میرا دھیان روشانے کی طرف گیا۔

"وہ کیوں نہیں جا رہی؟" میں جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی، اور اس کے پاس جا پہنچی۔ وہ بڑی بچی کے غسل خانے کے بیسن کے اوپر کا شیشہ سر کر چھڑک چھڑک کر چمکا رہی تھی۔

"اے یہ تم اپو کی مہندی میں کیوں نہیں جا رہیں"۔ میں نے پیچھے سے اسے پکڑا۔ جواباً وہ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جا تو نہیں رہی تم۔"

اس نے کالا کالا سا اخبار کا ٹکڑا ڈسٹ بن میں پھینکا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"کیا بلال احمد کی وجہ سے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اس کا چہرا دیکھتی رہ گئی۔

"مگر تم کیوں نہیں جا رہیں۔ ابھی مہر بدحواس آئی تھی یہ مژدہ سنانے، اس نے بغور مجھے دیکھا۔

"بس۔ بس۔ یونہی۔" میں نے نگاہیں چرالیں۔ مگر روشانے سیدھی سادی ضرور تھی۔ بدھو ہرگز نہیں تھی۔ وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

"طینی اپو سے تو تمہاری بڑی گاڑھی چھن رہی تھی۔ ان کا کوئی اوٹ پٹانگ فنکشن چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں، اور اب ان کی مہندی کا فنکشن اٹینڈ نہیں کر رہی۔"

"بس دل نہیں چاہ رہا۔" میں کہاں پھنس گئی تھی۔ جانے کو پلٹی تو اس نے میرے گرد اپنے بازو حمائل کر لیے۔

"سچ سچ بتاؤ، کہیں سبرینہ لالہ جی کی وجہ سے تو نہیں انہوں نے تو منع نہیں کیا تمہیں۔" وہ چونک کر پوچھنے لگی۔ میں ایک دو پل کچھ نہ بول پائی، پھر اس کا ہاتھ جھٹکے سے ہٹا دیا۔

"میں ان کی کوئی پابند نہیں ہوں۔ سمجھیں کہ ان کا

کہنا مانتی پھروں۔" پتا نہیں کیوں یکدم بہت سا غصہ آگیا۔

"ہمارے بزرگ تواب کر رہے ہیں جناب کر پائیں؟" وہ کھلکھلائی، جیسے یہ سوچ ہی اسے محظوظ کر رہی تھی، اور جانے ــــ میرے دماغ میں کیا آیا میں نے اسی دم جانے کا فیصلہ کرلیا۔

"میں نے مہرو سے ایسے ہی مذاق کیا تھا، جاؤں گی کیوں نہیں آج کے فنکشن کے لیے اتنا پیارا سا جوڑا بنایا ہے، ایویں ہی نہیں جاؤں گی۔" میں اسے ہنستا ہوا چھوڑ کر کمرے سے چل دی۔

اور جب تیار ہو کر نکلی تو پہلا ٹکراؤ سبز خان سے ہوگیا۔

وہ لابی میں داخل ہو رہے تھے جبکہ میں نکل رہی تھی۔ ہمارے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ مجھے یکدم یوں اپنے سجے سنورے سراپے کے ساتھ ان سے سامنا ہو جانے پر خفت اور شرم سی محسوس ہونے لگی۔

مہندی رنگ کے کرتے اور بلیک پاجامے میں بڑا سا ہلکے کام والا دوپٹہ کندھے پر پھیلا رکھا تھا۔ کانوں میں امی نے اپنے اسٹون والے جھمکے ڈال دیے تھے۔

وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہے تھے، اور جانے کس احساس کے تحت لبوں کو دانتوں میں دبا کر چھوڑ دیا۔

"آج تو جا رہی ہو، مگر شادی میں جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ان کے منہ سے گویا انگارے پھوٹ نکلے۔

ان کی خوش نما آنکھوں میں برہمی اور تلخی تھی، میں اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی، ششدر رہ گئی۔

"تمہارے ایک نہ جانے سے اُس کی شادی رُک نہیں جائے گی۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور لابی میں داخل ہوگئے۔ میں غصے سے پلٹی۔ میرے اندر سے احتجاج کی لہریں اٹھیں، مگر اندر ہی دم توڑ گئیں۔

اپنے کمرے سے عمو جان نکل رہے تھے انہوں نے میرا دھواں ہوتا چہرا دیکھا، پھر سبز خان کو۔ مگر وہ اس تندی سے لونگ روم میں گم ہو چکا تھا۔

اس تذلیل پر میری آنکھیں جلنے لگیں۔

میرا دل چاہا، میں اس شخص کا جا کر منہ نوچ لوں۔ اس کے اس حکم پر با آوازِ بلند احتجاج کروں۔ چیخوں چلاؤں، پھر ٹھنچوں مگر۔ عمو جان پر نظر پڑی تو ایک اذیت آمیز بے بسی کا احساس روح میں اُتر گیا۔ ان کے چہرے پر بھی تکلیف کا ایک رنگ ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ میرے قریب آگئے۔

"بہت زیادتی کر رہا ہوں، میں تمہارے ساتھ؟" انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا تو میں پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"ارے نہیں عمو جان! میرا جانا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے، کل کیا آج بھی نہیں جاتی، آپ پھپھو سے کہہ دیجیے گا کہ بلوشہ بیمار ہے۔"

"بلوشے!" انہوں نے مجھے پکارا۔ مگر میں رکی نہیں اور بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

غصہ، نفرت۔ تذلیل اور بے اختیاری پر میرا رواں رواں سلگنے لگا تھا، مجھے لگا جیسے اس شخص نے مجھے جلتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔

مگر نہیں ان شعلوں میں مجھے خود میرے ماں باپ تائی اماں، عمو جان۔ سب نے منصوبے کے تحت جھونکا ہے۔

میرے اندر چنگاریاں اُڑنے لگیں، میں نے غصے سے دوپٹہ نوچ پھینکا۔ روشنے باتھ روم سے برآمد ہوئی، اور مجھے صوفے کے کشن اٹھا اٹھا کر پھینکتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کک۔ کیا ہوا وشی؟ تم جا نہیں رہیں؟" میں بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔

"وشی! پلیز بتاؤ نا کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں، کچھ نہیں رہ بتانے کو۔ روشے تمہارا لالہ ذہنی مریض ہے، پاگل ہے وہ۔ ایک وحشی درندہ ہے۔ میرے ارمانوں کا خون چوسنے والا درندہ۔" میں نے تکیہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"وِشی کیا کر رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں، مریض ہے وہ، اذیت دے کر خوش ہوتا ہے، کسی کا بدلہ مجھ سے لے رہا ہے بزدل کم ہمت۔ کیا بگاڑا ہے میں نے اس کا۔ کیا قصور ہے میرا۔

تائی اماں کی آخری خواہش مجھے جہنم میں جھونک گئی۔ یہ پورا گھر مل کر مجھے ایسی آزمائش کی دلدل میں دھکیل رہا ہے جس سے میں کبھی نہیں نکل سکتی۔ آزمائش کے اس جہنم میں جل جل کر مر جاؤں گی۔"

"پلوشے! کیا اول فول بک رہی ہو۔" روشانے گھبرا کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ شاید مجھے پاگل خیال کرنے لگی تھی، اس کے خیال میں میری ذہنی رو بہک گئی تھی، وہ اٹھنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

"س۔ سوری۔ سوری روشانے! پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ دیکھو۔ دیکھو تم کسی کو مت بتانا۔" میں نڈھال سی گر گئی۔ وہ گلاس میں پانی بھر کر مجھے پلانے لگی۔

مگر بھلا اتنے سے پانی سے میرے اندر کا الاؤ کیسے بجھ سکتا تھا۔

"سبر یز لالہ نے کچھ کہا ہے۔" وہ مجھے سنبھلتا دیکھ کر پوچھنے لگی۔ میرے لبوں پر ایک مجروح مسکراہٹ پھیل گئی۔

"انہیں میرا جانا پسند نہیں ہے طیبی آپو کے گھر، بس اس وجہ سے مجھے غصہ آ گیا ہے، اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"پتا نہیں انہیں طیبی آپو سے اتنی نفرت کیوں ہے۔" روشانے کے چہرے پر رنج پھیل گیا۔

(ہاں اسی نفرت نے تو اسے بھی بلال احمد کی زندگی بنانے سے روک دیا تھا۔ اس کے نوخیز جذبے جوان ہونے سے پہلے ہی نوچ لیے تھے، اس ظالم نے)۔

"تم دل برا مت کرو سبر یز لالہ صرف غصے کے تیز ہیں، دل کے بہت اچھے ہیں یقین کرو وِشی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔" اس کی طفل تسلیاں میرے کسی زخم کا مرہم نہیں تھیں۔

طیبی آپو تو شادی کے چوتھے روز ہی ہنی مون ٹرپ پر نکل گئیں۔

"جلال ہاؤس" میں ان کی دعوت بھی التوا میں پڑ گئی، جواب ان کی واپسی پر رکھ دی گئی تھی۔

ادھر "جلال ہاؤس" میں ارباز لالہ اور آمنہ کی شادی ہنگامہ جاگ اٹھا۔ اور ان کے ولیمے کے روز میری اور سبر یز خان کی منگنی ہونا قرار پائی۔

سب کے چہرے کھلے پڑ رہے تھے۔ فطری بات تھی میرے اندر ابھی جذبے انگڑائیاں لے رہے تھے۔

خوبصورت۔ روپہلے جذبے جو مثل مہتاب کی صورت ابھرے تھے اور بھلا ابھرنے والے مہتاب کا رستہ بھی کوئی روک سکا ہے۔

میرا جوڑا روشانے نے خود پسند کیا تھا، وہ عمو جان اور ارباز لالہ کے ساتھ جا کر لے آئی تھی۔ اور اب سب کو دکھا دکھا کر داد وصول کر رہی تھی۔

میرون اور اسکن کلر کے کنٹراس کے خوب گھیر دار پشواز میں بے حد نفیس اور جگمگاتا کام کیا ہوا تھا۔ ہر دیکھنے والی آنکھ کو خیرہ کر رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں شرم آ گئی۔

"یہ پہنوں گی میں۔"

"نہیں، یہ بانو پہنے گی۔" روشانے نے مجھے گھورا۔ (بانو ملازمہ تھی ہماری)۔

"اسے شاید یقین نہیں آ رہا۔ کیا اب سبر یز لالہ خود کہیں گے کہ ڈیئر وِشی یہ تمہارے لیے ہے اور اسے تم۔ ارے سبر یز لالہ کو تو دکھایا ہی نہیں۔"

روشانے کو یکدم یاد آ گیا اور اچھا ہوا، اس کی فضول گوئی کو بھی بریک لگ گیا، وہ سب کچھ سمیٹ کر کمرے سے نکل بھاگی پیچھے سب ہنسنے لگیں۔

عمو جان کے چہرے پر بھی بڑی خوشگوار مسکراہٹ تھی۔

دل گیا تم نے لیا، ہم کیا کریں!
جانے والی چیز کا غم کیا کریں!
بخش دینا چاہیے گستاخیاں!
دل ہی قابو میں نہیں ہم کیا کریں!

روشانے بڑا خوبصورت دف بجا رہی تھی' اور میں لہک لہک کر گا رہی تھی۔ تالیاں بجا کر سب میرا ساتھ دے رہے تھے۔ "جلال ہاؤس" میں پہلی خوشی تھی۔ سب بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہے تھے' فیصل اور ایمان' ارباز لالہ کو پکڑ کر ابھی کمرے میں لے آئے تھے' جبکہ آمنہ بیچاری ہمارے نرغے میں پھنسی بیٹھی تھی۔ پیلے رنگ کے دوپٹے میں اس کا چہرا بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔

تند خو ہے کب سنے وہ دل کی بات
ایک برہم کو اور برہم کیا کریں

میں مزید اونچی آواز میں گانے لگی۔ اسی دم سبز ریز خان پر میری نظر پڑی۔ وہ اسی کمرے کے داخلی دروازے پر ایستادہ تھے۔ گہرے براؤن رنگ کے شلوار سوٹ میں خاصے فریش دکھائی دے رہے تھے' ان کا سارا دھیان میری طرف ہی تھا۔ میرا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں کھسیا کر چپ ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" روشانے دف روک کر پوچھا۔ "گاؤ نا۔"

"تم سب لوگ بھی گاؤ نا۔ میرا تو گلا اب دکھنے لگا ہے۔" میں سر جھکا کر ڈھولکی کی تنی رسیوں کو کسنے لگی۔ وہ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

"آؤ یار! تم کہاں رہ گئے تھے' برے پھنسے ہیں ادھر ہم۔" ارباز لالہ انہیں دیکھ کر مدد کو چلائے۔

"مجھے تو کوئی پھنسے ہوئے نظر نہیں آ رہے بلکہ بڑے خوش باش ہی دکھائی دے رہے ہو۔"

"بالکل درست فرمایا۔ محترم ان ہی خوشیوں کی تلاش میں تو دوڑتے دوڑتے آ گئے ہیں 'جلال ہاؤس'۔" سیف کی بات پر ارباز لالہ نے ایک گھونسہ اس کے شانے پر رسید کر دیا۔ آمنہ تو موقع پا کر کمرے سے نکل بھاگی تھی۔

"ارے لڑکیو! تم چپ کیوں ہو گئیں۔ گاؤ بھی' بلوشے ماشاء اللہ تم تو بڑا پیارا گا رہی تھیں' چچی مجھے اچھے سے دیکھ کر لو لیں۔"

"شکر کریں امی! ان کی بے سری ڈفلی بند ہوئی' ہمارے تو کان دہائی دینے لگے تھے۔" ایمان کانوں کو سہلانے لگا۔

"تو اُٹھ کر چلے جاتے' کس نے باندھ کر بٹھایا تھا یہاں؟" میں جلال میں آ گئی۔

"ارے یہاں کوئی باندھ سکتا ہے' ہم تو کچے دھاگے سے بندھے خود ہی چلے آئے جناب۔ بہرہ ہونے کے لیے۔" اس نے جھک کر مجھے طیش دلایا۔ میں نے روشانے کے ہاتھ سے ڈفلی لے کر اس کی طرف اچھال دی مگر وہ جھکائی دے گیا۔ ڈفلی چھن چھنک کرتی صوفے سے ٹکرا کر قالین پر گر گئی۔

"توبہ توبہ پوری ہلاکو ہو۔" ایمان اس حملے کے لیے تیار ہرگز نہیں تھا۔ بال بال بچ گیا تھا اب مجھے گھور رہا تھا۔

"سبز ریز لالہ! آپ کا تو اللہ ہی حافظ ہے دیکھ رہے ہیں۔ کتنی خطرناک توپ داغی ہے اس نے مجھ پر۔ یہ تو اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ عین شادی والے روز اندھا نہیں تو کانا ضرور ہوتا۔ آپ کیا کریں گے سبز ریز لالہ۔ دیکھ لیا یہ حشر آپ نے۔ سوچ لیں' ابھی بھی وقت ہے۔"

میرا دل چاہا دف اٹھا کر دوبارہ اس کے سر پر بجا دوں۔

"یہ بھی دیکھا ہے کہ نشانہ بہت کمزور ہے' یوں بھی تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔" انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ذرا سی نظریں اٹھا کر مجھے بھی گویا سلگا ڈالا۔ میں پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

میں آج بے حد خوش تھی' مزید وہاں رک کر ان کی کڑوی کسیلی باتوں سے بدمزہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ آمنہ کی شادی کا ہر ہر فنکشن ہم نے خوب انجوائے کیا۔ اور اس شادی میں آمنہ کی بڑی خالہ کو روشانے بے حد بھا گئی۔ انہوں نے بارات والے دن ہی اپنی بہن یعنی چچی خانم سے بات کر ڈالی تھی' اور انہوں نے گلو جان کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی تھی۔ یہ تو ہمیں شادی کے بعد معلوم ہوا تھا۔ آمنہ کے ولیمے میں خود میری اپنی منگنی تھی۔

جگمگاتے لان کی آراستہ روش سے اسٹیج تک آتے ہوئے میرا حال برا ہو گیا۔ یہ تو مجھے پہلی بار پتا چلا کہ دلہن بن کر کیا درگت بنتی ہے۔

پتا نہیں کہاں سے اتنی ڈھیروں کے حساب سے

شرم آ رہی تھی۔ حالانکہ سارے اپنے تھے۔ مگر ہر کسی سے ہی شرم آئے جا رہی تھی، ارباز لالہ بہت جچ رہے تھے، بلیک تھری پیس سوٹ میں وہ مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے، ان کی سنہری دمکتی آنکھیں گاہے بگاہے آمنہ پر اٹھتیں جو گولڈن اور میرون کنٹراس کے پیشواز میں میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ ایک دن کی دلہن تھی، اس لیے کچھ لجائی لجائی بیٹھی تھی، بولتی بھی بند تھی۔

اچانک سبرینہ خان کو سارے لڑکے پکڑ کر اسٹیج تک لے آئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے کرتے کی طرح اکڑے ہوئے تھے۔ مگر آج ان کا چہرا بہت زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا، یا مجھے ہی ایسا دکھائی دے رہا تھا۔

سیف کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ وہ لگاتار تصاویر کھینچ رہا تھا۔ ارباز اور روشانے نے انہیں زبردستی انگوٹھی تھما دی۔

"اب یہ کام تمہیں کرنا ہے ہمیں نہیں۔" ارباز لالہ ان کی پیٹھ پر دھموکا مار کر بولے۔

ان کے چہرے کے تاثرات کیا تھے۔ میں دیکھنے سے قاصر رہی۔ ہاں جب انگوٹھی پہنانے کو میرا ہاتھ تھاما تو میرا رواں رواں جیسے کانپ رہا تھا۔

دل کی دھڑکن اتنی شوریدہ ہو گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے میرے اطراف بیٹھے لوگ بھی یہ دھڑکن سن رہے ہیں۔ میرا سر اور جھک گیا، اور ان کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں میرا ہاتھ کانپنے لگا۔

"بھئی، بیا اتنی سردی کیوں لگ رہی ہے تمہیں؟" آمنہ نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا اور سب کی توجہ میرے ہاتھ کی طرف کر دی۔

"گلیشیئر سے ہاتھ ٹکرا گیا ہے۔"

"خوشی کا۔"

"نہیں خوف کا۔" روشانے قہقہہ مار کر ہنسی سب ہی ہنس پڑے۔ ہر کوئی مجھ پر فضول سے فقرے چست کرنے میں آزاد تھا۔ پوزیشن ہی میری اتنی فضول ہو رہی تھی۔

"اب تو ہاتھ چھوڑ دو سبرینہ!" چچی شرارت سے بولیں تو انہوں نے جھٹکے سے میرے ہاتھ سے اپنی گرفت ہٹالی، اور گویا قہقہوں کا طوفان امڈ آیا۔ یہ سارے منظر کیمرے کی آنکھ میں مقید ہوتے گئے۔

کتنے روپہلے لمحات تھے۔ خوشی سے بھرے انمول مسرت سے کھنکتے، مگر کتنی جلدی گزر گئے۔

میں تصاویر دیکھ رہی تھی۔ جو دھل کر آئی تھیں۔ ہر ہر تصویر میں وہ اتنے دلکش لگ رہے تھے، کہیں کہیں ان کے گہرے گلابی لبوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیکھ کر میرے اندر کچھ ٹوٹنے لگا۔ (صرف انگلی میں اپنا نام ڈال دینے سے کیا ہوتا ہے، سبرینہ خان اپنے دل میں بھی اسے سجالو تو کوئی بات ہے)۔

تصویریں کیا آئیں کہ سب اس پر ٹوٹ پڑے تھے آمنہ اور ارباز لالہ کی بہت شاندار آئی تھیں۔ پھپھو نے فون کر کے تصاویر منگوائیں۔ طینی آپو بھی ہنی مون سے آ چکی تھیں۔ میں خود ان کے یہاں چلی آئی۔ طینی آپو کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ وہ ایمبرائیڈری والے زرد سوٹ میں کھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ —— شادی میں شرکت نہ کرنے پر شکوہ بھی کیا۔ پھر تصویریں دیکھ کر وہ خاصی دیر تک مجھے دیکھتی رہیں۔ پھپھو کے اٹھ جانے کے بعد وہ میرے قریب آ بیٹھیں۔

"میرے لیے یہ خبر واقعی حیران کن ہی نہیں —— پریشان کن بھی ثابت ہوئی کہ تمہاری اور سبرینہ کی منگنی۔ امی نے جب فون پر بتایا تو میں تو حیران پریشان رہ گئی۔ سچ بتاؤ وشی! تم خوش ہو؟ میرا مطلب ہے، اس میں تمہاری رضا بھی شامل ہے یا؟"

مجھے طینی آپو کی اس حیرانی پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی میں نے سر ہلا دیا۔ اور گویا ان کے تحیر میں اضافہ ہو گیا۔ وہ مجھے یوں بے یقینی سے دیکھنے لگیں، جیسے میں نے کوئی انہونی کر دی ہو۔

"لگتا ہے شکل و صورت پر مر مٹیں اس کی؟" وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسیں۔

"شکل صورت بھی بری نہیں ہے؟" مجھے جانے کیوں ان کی ہنسی بہت بری لگی۔

"ہاں بھئی۔ اس صورت پر تو ایک جہاں مرتا ہے خیر مقابلے پر تو تم بھی —— کم نہیں ہو۔ مگر" انہوں

نے رک کر مجھے دیکھا پھر اپنے کٹے ہوئے بالوں میں اضطرابی انداز میں انگلیاں چلانے لگیں۔

"مجھے تمہارے اس فیصلے سے شاک پہنچا ہے دشی۔ کیا نظر آیا ہے تمہیں "جلال ہاؤس" کے اس روایت پسند اور اکھڑ شخص میں۔

سنو! اب بھی موقع ہے تم اس رشتے سے انکار کردو، اور "جلال ہاؤس" سے باہر کے کسی بھی اچھے آدمی کو ان پر ترجیح دو۔"

"پلیز اپو۔!" میرے دل کو زبردست دھچکا لگا تھا میرے اندر غصے کا ابال اٹھنے لگا۔

"تمہیں کیا خبر جانم کہ آزاد زندگی کیا ہوتی ہے عورت کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے کہ ایک کھونٹے سے باندھ دی جائے۔ یاد رکھنا دشی! تمہاری لائف اپنی نہیں رہے گی۔"

"ہماری لائف ویسے بھی ہماری اپنی کم ہی ہوتی ہے اپو۔" میں اٹھنے لگی۔ "مجھے "جلال ہاؤس" کا فرد کہلانے میں فخر ہے، اور "جلال ہاؤس" کے مرد میرے آئیڈیل ہیں۔ میں بہت خوش ہوں اپو۔" میں رخ موڑ کر رسانیت سے بولی۔ میرے انداز میں ناراضگی بھی تھی اور قطعیت بھی۔ وہ چپ ہو گئیں۔

مجھے طیبی اپو کے خیالات نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ ان کی باتوں سے احساس ہوا کہ انہوں نے شاید کبھی سبریز خان کو چاہا ہی نہیں تھا مگر وہ شخص ان کی بے وفائی سے سراپا بدل کر رہ گیا تھا۔ اور خود کو ہی اذیت نہیں دی بلکہ اذیت کا دائرہ وسیع کرتے کرتے مجھ تک آپہنچا اور صرف یہ تنگ دائرہ مجھ تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

پتا نہیں میں تشنہ ہوں یا سبریز خان۔

اگر دونوں تشنہ ہیں تو کیوں ہیں کس کے لیے۔

سبریز خان جس کی بے وفائی کا انتقام مجھ سے لے رہے تھے وہ تو وقت سے خوشیاں کشید کر رہی ہیں، وہ تو اپنے ماضی میں جھانکتی بھی ہیں تو زہر خندی کے ساتھ۔

میرے اندر سے دھواں اٹھنے لگا، مجھے یکدم طیبی اپو سے، سبریز خان سے، سب سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔

یہ کیسی خوشی ہے کہ میں خوش بھی نہیں ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے ایک ہاتھ میں کسی نے پھول دے دیے ہوں، اور دوسرے ہاتھ پر انگارہ رکھ دیا ہو۔

میں پھول کی مہک کیسے اپنے اندر اتاروں، جلتی سلگتی ہتھیلی روح میں آگ لگا رہی ہے۔

انہی دنوں آمنہ کی خالہ، باقاعدہ روشانے کے لیے اپنے بیٹے کا پیام لے کر آ گئی تھیں۔ شرجیل خان سول انجینئر تھا۔ خوبرو تھا۔ اچھے خاندان کا تھا۔ آمنہ تو اس کی تعریفیں کرتے نہ تھک رہی تھی۔

روشانے بڑی ملول دکھائی دے رہی تھی ان دنوں۔ وہ جانتی تھی۔ یہی رشتہ اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ یہی نام لوح محفوظ پر لکھا گیا ہے، اس کے نام کے ساتھ۔

"روشے!" میں کمرے میں آئی تو اسے اندھیرے میں گھٹنوں میں منہ دیے دیکھا۔ "پاگلے تو رو رہی ہے۔"

"نہیں تو۔" اس نے روتی روتی آنکھیں اوپر اٹھائیں، پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے دشی! ہم جو چاہتے ہیں وہ کیوں نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اتنی بے بس، بے اختیار کیوں ہوتی ہیں، اپنی شکست کے ناآسودگی کے آنسو بھی کھلے عام نہیں بہا سکتیں۔"

اس کی آزردگی نے میرے اندر دراڑیں ڈال دیں۔ میرا دل اس کے سلگتے آنسوؤں سے بھر گیا۔

"لڑکیاں جو ہوتی ہیں۔" میں نے اس کا چہرا اوپر اٹھایا اس کے بال سہلائے، اور چہرا پونچھنے لگی۔

"تیری قسمت میں بلال احمد نہیں، شرجیل خان لکھا ہوا ہے، پگلی لڑکی ہو یا لڑکا قسمت سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ تقدیر کے رستے کوئی نہیں بدل سکتا۔" (میرے تصور میں سبریز خان تھا۔ اتنا نڈر بھرپور مرد ہو کر بھی تو وہ ہار گیا تھا تقدیر سے، اور اب ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں چنتا پھر رہا ہے۔)

"مجھے یقین ہے روشے تو بلال احمد کو بھول جائے گی۔ شرجیل خان بہت اچھا ہے۔"

میں جانتی تھی میری تسلیاں بڑی خالی خولی سی

ہیں، مگر کبھی کبھی یہ ننھی تسلیاں بھی زخموں پر مرہم رکھتی ہیں۔ بہلانے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ رو دینے سے ہنس پڑتی۔ اس کی ہنسی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"مجھے خبر ہوتی کہ بلال احمد طیبی آپو کا دیور ہے تو میں کبھی بھی اس کی تمنا نہ کرتی وشی۔ یعنی آپو کے تو گھر کے راستوں کے پتھروں سے بھی سبرینہ لالہ نفرت کرتے ہیں" وہ ملول سی ہو کر بولی۔

"شکست کھایا ہوا شخص صرف نفرت کر سکتا ہے ہر کسی سے۔"

"کیا محبت جان کر ہوتی ہے؟" میں ہنس پڑی۔ "پاگلے یہ تو اس بادل کی طرح ہے جو اچانک ہی امڈتے ہیں، اور برسنے لگتے ہیں۔ دل کی زمین جل تھل ہو جاتی ہے، اور خوبصورت جذبوں کی ننھی ننھی کونپلیں لہلہا لگتی ہیں۔ اگر کونپل کونپل ہی رہے، تو اچھا ہے سدرشانے۔ ورنہ تناور درخت بن جائیں تو دور دور تک پھیلی جڑوں سے انسان ہار جاتا ہے۔ چلو آؤ منہ دھو لو۔ آمنہ اور ارباز لالہ کو ابھی رخصت بھی کرنا ہے، انہیں سی آف کرنے نہیں چلو گی؟" میں نے پیار سے اس کے رخسار تھپتھپانے لگی۔ وہ اپنے اسی اضمحلال کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"پتا نہیں میری تسلیوں نے اس کے درد پر پھاہے رکھے تھے۔ یا نہیں، مگر مجھے یقین تھا وہ ابھی اتنی دور نہیں گئی تھی۔ کہ واپسی ناممکن ہو جاتی۔

شام کی فلائٹ سے ارباز لالہ اور آمنہ اسلام آباد جا رہے تھے۔ ہم سب گاڑیوں میں لد کر بصد جلوس اسے ایئرپورٹ چھوڑنے آئے تھے، اور اب رخصتی کا باقاعدہ سماں بندھ گیا تھا۔ آمنہ ہم سے لپٹ کر اور ہم اس سے لپٹ کر باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہے تھے۔

"مجھے تو لگ رہا ہے، میں آمنہ صاحبہ کو تختہ دار پر لیے جا رہا ہوں اور خود جلاد ہوں۔" ارباز لالہ ہماری ان برساتوں سے گھبرا کر بولے۔ میں کھسیا کر آمنہ سے الگ ہوئی، وہ بیچاری ننھی سی جان سب سے لپٹ لپٹ کر رو رو کر اپنا حال برا کر چکی تھی۔ آنکھوں کے کاجل اور لائنر کی لکیر اب سیاہ لکیروں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مشکبار — گیسو چہرے پر آنسوؤں سے چپک گئی تھیں۔ چہرے کو رگڑ رگڑ کر وہ مزید دہشت ناک بنا رہی تھی۔

"اپنا حلیہ تو درست کر لو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ لمبا تڑنگا لڑکا اس بھولی بھالی لڑکی کو بھگا کر لیے جا رہا ہے۔" سیف نے اس کے حلیے کی طرف توجہ دلائی سب ہنس پڑے۔

"مجھے تو کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے کہ میں اسے زبردستی لے کر جا رہا ہوں۔ اگر تم جانا نہیں چاہتیں تو۔ واپس چلی جاؤ ان کے ساتھ۔ میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔" ارباز لالہ مسکراہٹ دبا کر اسے چھیڑنے لگے وہ بیچاری سچ مچ سہم گئی۔

"جی نہیں۔ میں ساتھ جاؤں گی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ پھر کھسیا گئی ہم سب محظوظ ہو کر ہنسنے لگے۔

واپسی پر روشانے مجھے ارباز لالہ کی گاڑی میں بٹھا کر خود ابھی آئی کہہ کر جانے کہاں اڑن چھو ہو گئی تھی۔ میں سیٹ کی پشت پر ٹیک لگائے ایئرپورٹ کی رونق کو دیکھنے لگی کہ ڈرائیونگ سیٹ پر سبرینہ خان آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کھنکارا۔ یوں جیسے صرف گلا صاف کرنے کا ہی تصور ہو۔ میں انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی اور جو پیچھے دیکھا تو سیف کی سفید کرولا میں وہ ساری لدی پھندی روانہ ہونے کو تیار تھیں۔ روشانے مجھے ہاتھ ہلا کر ہنس رہی تھی۔

"بہت شوق ہے تمہیں میرے ساتھ تنہا جانے کا؟" انہوں نے اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں ہنس کر پوچھا۔ میری پیشانی اس تذلیل پر جل اٹھی۔

میرا ہاتھ غصے سے دروازے کے ہینڈل پر بڑھا مگر گاڑی کے تمام لاکرز آٹومیٹک تھے۔ اے سی کا بٹن کھول کر شیشے بھی انہوں نے اوپر کر دیے تھے۔

"مجھے روشانے بٹھا گئی تھی۔ میں کہیں اسے سیف ڈرائیو کرے گا۔" میں نے اپنی پوزیشن کلیئر کر دینا مناسب سمجھا۔ ان کے لبوں کی تراش میں ایک لمحے کو مسکراہٹ کوندی۔ جو مجھے جلا کر خاکستر کر گئی۔

"کبھی کبھی انسان کو فول بننا بھی اچھا لگتا ہے۔"

میرا دل چاہا، میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں۔

مگر جواب دینے کے بجائے میں ان کی طرف سے رُخ موڑ کر خاموش بیٹھ گئی۔ تا کہ وہ میرے رویے سے ہی محسوس کر لیں کہ ان کا اندازہ کتنا غلط ہے۔ ایئرپورٹ سے جلال ہاؤس تک کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ انہوں نے گاڑی کی دبیز خاموشی کو توڑنے کے لیے ڈیک کھول دیا تھا۔ یا پھر یہ ان کی عادت رہی تھی۔

شعر
اپنی آنکھوں کے سمندر میں اُتر جانے دے
تیرا مجرم ہوں مجھے ڈوب کے مر جانے دے

بھاری آواز خاموشی میں عجیب سی محسوس ہونے لگی۔ آواز گو کہ دھیمی تھی مگر با آسانی سماعتوں میں اتر رہی تھی۔

پتا نہیں یہ ان کی اپنی چوائس تھی یا ارباز لالہ کی، گاڑی میں خاصے کیسٹ پڑے تھے۔

شعر
اے نئے دوست میں سمجھوں گا تجھے بھی اپنا
پہلے ماضی کا کوئی زخم تو بھر جانے دے

میرے اندر یکدم شور سا اُٹھا۔ ایک اضطراب وجود پر طاری ہونے لگا۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا مگر ان کی نظریں ونڈ اسکرین پر تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا غزل کے بولوں میں گم ہوں۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔

شعر
آگ دنیا کی لگائی ہوئی بجھ جائے گی:
کوئی آنسو میرے دامن پر بکھر جانے دے
زخم کتنے تیری چاہت سے ملے ہیں مجھ کو
سوچتا ہوں کہ کہوں تجھ سے مگر جانے دے

میں نے کھٹ سے بٹن آف کر دیا۔ گاڑی میں پہلے جیسا سکوت چھا گیا۔ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا نہ دوبارہ بٹن آن کیا۔ بس اسی خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے۔

"آپ طینی آپو کو کتنا چاہتے تھے؟" میرا جملہ یقیناً غیر متوقع تھا ان کے لیے۔ پیر ایکسیلیٹر پر بڑے زور سے پڑا تھا۔ بریک چرچرائے مگر دوسرے پل گاڑی آہستہ روی سے چلنے لگی۔ انہوں نے تیوری چڑھا کر میری طرف رُخ کیا۔ چہرے پر بے حد ناگواری رقم تھی، مجھے بہت اچھا لگا۔

"کتنا سے کیا مطلب ہے؟" ان کے لہجے میں کاٹ تھی میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"محبت تو بہت وسیع سمندر ہے آپ اس میں کتنا ڈوبے تھے؟"

"اچھی بات ہے کہ تم آگاہ ہو ماضی سے" انہوں نے ایک دو لمحے توقف کے بعد کہا۔

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں" میں اس جواب پر جلبس گئی۔ مگر انہوں نے کچھ کہنے کے بجائے گاڑی ایک آئسکریم بار کے سامنے روک دی اور بھاگ کر آتے لڑکے کو دو بوتل کا آرڈر دے کر باہر دیکھنے لگے۔

اس کا مطلب تھا ان کے پاس میری اس بات کا جواب نہیں تھا۔ یا دینا نہیں چاہتے تھے۔

"بڑے بزدل ہیں آپ" میں طنز سے ہنس پڑی۔ انہوں نے لڑکے کے ہاتھ سے کوک کی بوتل لے کر میری طرف بڑھا دی۔ اور ایسا کرتے ہوئے سیدھا اپنی گہری سبز آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔

"محبت ہوتی کیا ہے جانتی ہو؟" ان کی آنکھیں بڑی لو دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری پلکیں لرز کر رخساروں پر جھک گئیں۔

"آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ اس بحرِ بیکراں سے آپ ہی گزرے ہیں" میں نے کوک کی بوتل پر اپنی گرفت کرتے ہوئے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی ظاہر ہے ایسا کوئی خوشگوار تاثر تو آیا نہیں ہو گا۔

وہاں گہری خاموشی چھا گئی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں۔ بڑی سُرخی تھی سبز آنکھوں کے اطراف مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہرٹ ہوئے ہوں میرے اس جملے سے۔ بڑا سہانا لگا مجھے یہ منظر۔

"کہتے ہیں محبت صرف ایک بار ہوتی ہے؟" میں نے تمسخر سے کہتے ہوئے اب اعتماد سے ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے اسٹرا کا کنارا اپنے سُرخ ہونٹوں کے درمیان پھنسا کر مجھ پر ترحم نظریں ڈالیں۔ میرا یہ با اعتماد طرزِ انداز ان کے لیے شاید انوکھا ہو گا۔

"یہ افسانوں اور فلموں کی باتیں ہیں کہ محبت ایک بار ہوتی ہے۔ یہ کوئی میتھس کا سوال نہیں ہے، سائنس کی تھیوری

نہیں ہے کہ ہر موسم ہر وقت ہر حال میں ایک ہی نیتجہ رہتا ہے۔ یہ انسانی کیفیت اور احساس پر مبنی جذبے ہیں ان کا امڈنا اور سر جھانا حالات پر منحصر ہے بقول تمہارے محبت سمندر ہے تو سمندر میں ڈوبنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اور کنارے لگنے والے بھی۔" انہوں نے ایک سپ میں بوتل خالی کر کے قریب آتے لڑکے کو پکڑا دی۔

"مگر میرے نزدیک محبت کا کوئی کنارا نہیں ہوتا۔ اور یوں بھی انسان دوسری بار محبت و حیت نہیں کر رہا ہوتا۔ بلکہ مقابل کو صرف دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔" میں نے اپنی دانست میں ان پر بھرپور طریقے سے چوٹ کی۔ وہ سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے ذرا سا ہنس پڑے۔

"تو یہ تعجب کی بات کہ مقابل وہ دھوکا خوشی سے کھا لیتا ہے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ یہ دھوکا ہے۔" انہوں نے سگریٹ کے ہمراہ گویا میرا دل بھی سلگا ڈالا میرے لبوں میں آگ دہک اٹھی۔

میں کتنی دیر بے حس بیٹھی رہ گئی، میری انگلیاں بوتل پر یکدم سخت ہو گئیں۔ پھر میں نے پلکیں جھپکیں اور آدھی سے زیادہ بھری بوتل ان کی طرف بڑھا دی۔

رگ رگ سے جیسے دھواں اٹھتا محسوس ہونے لگا انہوں نے جو تیر چلایا تھا سیدھا دل کے آر پار ہو گیا۔

میں یکدم شکستہ ہو گئی۔ میرے اعصاب مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھ گئے، دل چاہا اس کا گریبان پکڑ لوں۔ اور چیخوں چلاؤں۔

"کہ میں یہ دھوکہ خوشی سے نہیں کھا رہی۔ دھوکے باز اور فراڈی سفاک انسان۔ میں صرف عمو جان کی خوشی پر قربان ہو رہی ہوں۔

میں یہ طوق اس لیے پہن رہی ہوں کہ طینی ملو کی طرح باغی نہ کہلواؤں۔

بے حس ناخلف لڑکی نہ سمجھی جاؤں۔

پتا نہیں وہ اپنے اس چلائے ہوئے تیر پر کتنے شاداں اور مسرور ہوئے تھے میں نے پھر ان پر ایک نظر بھی ڈالنی گوارا نہیں کی۔ انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اچٹتی نظر مجھ پر ضرور ڈالی مگر میں نے رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

دل چاہنے لگا اس چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں۔ یہ طویل سفر اس شخص کی ہمراہی میں عذاب بن گیا میرے لیے۔

"کوئی اور سوال اگر ہے تمہارے ذہن میں تو وہ بھی پوچھ ڈالو۔ اچھا ہے ذہن میں گرہ نہ رہے۔" (یہ آج مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑے ہو کر جوابات دینے کا خیال کیونکر آ گیا۔)

میرا دل گمبھیر اداسی سے ہنس پڑا۔

"میرے ذہن میں کوئی غلط فہمیاں نہیں کہ مجھے کریں کر سوال کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں تو جو سامنے دکھائی دیتا ہے وہی دیکھتی ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔" آواز دھیمی تھی مگر اتنی ضرور کہ وہ با آسانی سن لیں۔

ایک عجیب سی افسردگی روح میں اترنے لگی، اس کے بعد ہم دونوں کے مابین گہری خاموشی چھائی رہی۔ جو نیلال یا ڈس کے پورچ میں پہنچ کر بھی نہ ٹوٹی۔ میں چپ چاپ اندر چلی گئی۔ روشانے مجھے دیکھ کر جتنی کی نمائش کرنے لگی۔ مگر میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

ان سب کے خیال میں ان لوگوں نے فلمی سچویشن کری ایٹ کی تھی اور ان کے خیال میں، میں سرخ چہرہ شرمیلی مسکراہٹ لیے واپس آؤں گی۔

ایسا ہونا کوئی ناممکن نہ تھا، ایک لڑکی اپنے منگیتر کے ساتھ اتنا طویل سفر کرے تو بہت سے خوبصورت یادگار دل پذیر لمحات گزرتے ہیں جو دلوں میں سرمستی پیدا کرنے والے جذبوں کی لو کو تیز کرتے ہیں، کبھی خاموشیوں کی زبان میں محبت آمیز گفتگو ہوتی ہے۔ اور یہ خواہش میرے اندر کروٹیں لے رہی تھی مگر۔

جہاں جذبوں کو رعایت نہ مل رہی ہو امیدوں اور خواہشوں کا اندھا قتل ہو رہا ہو وہاں احساسات اور جذبات کی تو پیچھے کر لینا ہی دانش مندی ہے۔ جہاں انا مجروح ہونے کا سو فی صد امکان ہو وہاں جذبے سمیٹ کر رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ اس سفر نے بجائے کوئی خوش فہمی جگانے کے ساری امیدوں کو نئے سرے سے توڑا تھا۔ اداسی ہی اداسی دل و جاں پر محیط ہو چکی تھی۔

عمر لب پر ہے تلخیٔ ایام ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے!

پتا نہیں کیوں میرا اب وہی کام کرنے کو دل چاہتا جس پر سبریز خان جلتے کڑھتے تھے مجھے پتا چلا طینی الو پھپھو کے یہاں رہنے آئی ہیں، میں روز جانے لگی اور اس روز سبریز خان سے ٹکراؤ ہو گیا میں خاصے فریش موڈ میں واپس آئی تھی، پھپھو کا ڈرائیور مجھے چھوڑ گیا تھا۔

لان میں ہی وہ میری راہ میں کسی چٹان کی طرح آکھڑے ہوئے۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا، تم سلطارے سے نہیں ملوگی پھر؟" ان کے خیال میں ڈر جاؤں گی، مگر میرے اندر تو آگ دہک اٹھی، میں نے اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر ان کی سبز آنکھوں میں ہلکورے لیتے غصے کو دیکھا۔

"میں جاؤں گی آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے۔ بلکہ اب تو روز جاؤں گی" یہ میرا لہجہ گستاخ ہو گیا۔ اور ان کا سفید چہرہ لال بھبھوکا، میری اس جرأت نے انہیں حیران کیا تھا، مگر دوسرے پل وہ طنز سے ہنسے۔

"تو گویا اب ضد میں جاتی ہو، انتقاماً شاید سب کر رہی ہو۔"

"جی نہیں انتقام بزدل لیتے ہیں۔ اور میں بزدل نہیں ہوں۔" میں ایک طرف ہو کر جانے لگی کہ انہوں نے بازو سے مجھے کھینچ کر روک لیا۔

"کیا ملتا ہے تمہیں اس سے مل کر، کیا سیکھتی ہو وہاں جاکر؟" ان کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ میرے اندر غصے کا ابال اٹھنے لگا۔ میں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ میرے اندر نا آسودگیاں سی چیخنے لگیں، بہت سا دکھ آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

میں نے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے جھٹکا دے کر چھڑایا۔

"مجھے سکون ملتا ہے ان سے مل کر، وہ ایک بہادر اور جرأت مند عورت ہیں کسی کی بے وفائی کا انتقام بزدلوں کی طرح دوسروں سے یا خود سے نہیں لیتی پھرتیں اور نہ فیصلے کر کے پچھتاتی ہیں وہ ایک۔" میری زبان ٹھہر گئی۔ چٹاخ کے ساتھ ان کا مضبوط ہاتھ میرے رخسار کو ہی نہیں میری روح کو بھی جلسا گیا۔

میں لڑکھڑا گئی۔ نفرت اور غصے سے میرا رواں رواں کٹنے لگا۔

"یہ کوئی عیب نہیں ہے جب انسان کے پاس دلائل ختم ہو جاتے ہیں تو اس کا ہاتھ ہی چلنے لگتا ہے۔" میں نے شولڈر بیگ کندھے سے ہٹا کر زور سے گھاس پر پھینکا۔

"میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ مگر میں نے معاف کیا آپ کو سبریز خان کہ آپ معافی کے ہی نہیں رحم کے بھی قابل ہیں، مگر افسوس سلطانہ جہاں آج بھی اپنے فیصلے سے خوش ہیں۔" میں رکی نہیں اور بھاگتی اندر چلی گئی، میرے یہ توہین آمیز الفاظ ان کی مردانگی اور انا — پر ضرب لگانے کو کافی تھے۔

میں باتھ روم میں جاکر بند ہو گئی۔

یہ اچھا ہوا یا برا۔ ایسا کر کے میں خوش تھی یا ناخوش۔ میں اب کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ بس اپنی زندگی کے ضائع ہو جانے کا دکھ منا رہی تھی۔ جس کی ڈور ایسے شخص کے ہاتھ میں تھما دی گئی تھی جو ناقدرا اور سفاک انسان تھا جس کا دامن محبت سے خالی تھا جس کے پاس صرف نشتر اور کانٹے تھے۔ اور وہی میری روح میرے دل میں اتارتا رہتا تھا۔ کتنی خوش نصیب ہیں طینی الو آپ۔ جسے چھوڑ دیا۔ وہ بھی آج تک آپ کی محبت میں گم ہے۔ اور جس کے ساتھ ہیں اس کی چاہتیں بھی ثمیث دل ہیں)

میں پانی کے چھینٹے منہ پر ڈالتی رہی مگر جو تپش اندر سے اٹھ رہی تھی وہ بجھ نہ رہی تھی۔

شام عمو جان میرے کمرے میں آئے تو بے حد مضمحل اور اداس دکھائی دے رہے تھے۔ میں لان میں کھلنے والی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر لبوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر ان کے بیٹھنے کو کرسی آگے کی۔

"آپ مجھے بلا لیتے عمو جان!"

"کیوں میں اپنی بیٹی کے پاس خود نہیں آسکتا؟" وہ میرے نزدیک ہی کھڑے ہو گئے پھر جلال ہاؤس کے بچوں کو دیکھنے لگے جو کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے پھر میرے کندھے پر اپنا شفیق بازو پھیلاتے ہوئے بولے۔

"بلوشہ بیٹی، میں بہت زیادتی کر رہا ہوں تمہارے ساتھ یہ خیال مجھے اب دن رات گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے، میں نے سبریز کی ہنسی کی تمنا کی اس کی مسکراہٹوں اور خوشیوں کی دعا مانگی مگر تمہاری ہنسی چھن جائے گی میں ایسا تو"

...باہتا تھا۔ کتنا خود غرض انسان ہوں میں بھی۔"

"عموجان، کیا کہہ رہے ہیں آپ!" میں نے انہیں تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔

"میرا خیال تھا۔ سبریز بدل جائے گا۔ مگر یہ میری خوش فہمی تھی یا کم فہمی۔ وہ اپنی مجروح انا کا انتقام شاید تم سے لے رہا ہے۔ اور اب مجھ سے یہ برداشت۔"

"نہیں عموجان! آپ غلط سوچ رہے ہیں۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی جس میں خاصی کامیاب بھی رہی۔

"تو پھر سارا دن کمرے میں بند کیوں رہتی ہو۔ جلال ہاؤس میں تمہاری شرارتیں، تمہاری ہنسی کیوں نہیں گونجتی۔"

"ارے واہ! اب میں کوئی پاگل ہوں کہ سارا سارا دن بلاوجہ ہنستی رہوں۔" میں زور سے ہنس پڑی۔

"مجھے سبریز سے اب ڈر لگنے لگا ہے — وحشی بیٹا!" عموجان کی آواز لرز رہی تھی۔ میں دھک سے رہ گئی۔ "وہ تمہارے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک بزدل اور کمزور انسان ہے۔"

"عموجان پلیز، مت کریں ایسی باتیں۔" میرے اندر وحشت اترنے لگی۔ مجھے اس شخص کی فکر نہیں تھی بلکہ عموجان کی، جو اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔

"چلیں باہر چلتے ہیں۔ دیکھیں، کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ شاید بارش ہو جائے۔" میں نے ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ میں خوفزدہ ہو رہی تھی اپنے آپ سے۔ کہ کہیں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ اور ان کی گود میں سر رکھ کر رو دوں۔ انہیں یہ احساس نہ دلا دوں کہ واقعی عموجان زیادتی ہو گئی ہے میرے ساتھ۔

"چلیں نا عموجان!"

وہ آہستگی سے کھڑے ہو گئے۔

جلال ہاؤس، ہلالان شام کی رنگینیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ بچوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ کوئی براؤن لارا بنا ہوا تھا۔ تو وسیم اکرم۔ ایک طرف چھوٹی نشاد ایمپائرنگ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ دور بڑی سی اسٹول پر بیٹھی روشانے کمنٹری کر رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ روشانے نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے شاید فرجیل خان کو دل سے قبول کر لیا تھا۔

میں اور عموجان شام کی چائے کے ساتھ بچوں کا یہ کھیل دیکھنے لگے۔ اور ساتھ ساتھ تبصرے بھی کرنے لگے۔ کبھی عموجان میری طرف دیکھنے لگتے اور میں محض انہیں مطمئن کرنے کے لیے زور زور سے تالیاں پیٹ کر چوکے چھکے کی داد دے رہی تھی ہنس بھی رہی تھی۔ کچھ دیر یہ سب ہوتا رہا۔ پھر عموجان کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گئے۔ میں چائے کی چسکیاں بھرتی رہی۔ کچھ لمحے خاموشی سے سرک گئے پھر عموجان کی آواز ابھری۔

"میں سبریز اور تمہاری جلد از جلد شادی کر دینا چاہتا ہوں۔ روشانے کی بات بھی طے ہو گئی ہے مگر میں اس کی منگنی وغیرہ سے پہلے سبریز کی شادی چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں، میں ایک خوشی تو دیکھ لوں۔"

انہوں نے بولتے بولتے میری طرف دیکھا۔ میرے اعصاب پر ایسا سناٹا چھا گیا تھا جیسا ہوا سے محروم جانداروں پر ہوتا ہوگا۔ مگر میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا بس سر اور بھی جھکا لیا۔

پتا نہیں کیوں عموجان میرے سامنے ہوتے تو مجھے اپنا دکھ دکھائی ہی نہ دیتا صرف اور صرف ان کا خیال رہتا۔ اس وقت بھی میں اپنے دل کی بکھری حالت پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔

"بلو بیٹے!" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "تم خوش تو ہو نا اس رشتے سے؟" پتا نہیں وہ بار بار کیوں پوچھتے رہتے تھے کس کی تسلی مقصود تھی۔

"میں آج ہی رحمان سے بات کرتا ہوں۔"

میں کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور یوں ظاہر کیا جیسے شرم کے باعث وہاں سے بھاگ رہی ہوں جبکہ مجھے وہ آنسو چھپانے مقصود تھے جو میری آنکھوں کے کناروں سے نکلنے کو مچل رہے تھے۔

میں ہار گئی تھی عموجان کے سامنے ان کے اکلوتے ظالم بیٹے کے آگے۔

یہ شکستیں مختلف نوعیت کی تھیں مگر میرے ہاتھ میں تو سوائے شکست کے کچھ نہ آیا تھا۔

ع تیری نظر کا گلہ کیا جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

رات ڈنر پر عموجان ابو سے بات ہی نہ کر سکے۔

پھپھو اچانک روتی دھوتی چلی آئیں۔ پتا چلا طنین ابو اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے آ بیٹھی ہیں۔ سب حیران پریشان ہو گئے۔

ان کے درمیان یہ معرکہ آرائی کوئی مہینہ بھر سے تھی بقول پھپھو کے میں نے اور اس کے ابا نے تو بہت سمجھایا کہ وہ واپس چلی جائے مگر وہ نہیں مان رہی۔ اس کی تو ایک ہی ضد ہے کہ ابرار اس کی ساری شرائط مان لے تب ہی وہ واپس جائے گی۔

صرف چند مہینوں میں اتنے جھگڑے۔ میں تو متحیر رہ گئی۔ وہ تو بہت خوش باش دکھائی دے رہی تھیں۔ بلا روک ٹوک کے گھومنا پھرنا مخلوط پارٹیاں، سینما اٹینڈ کرنا۔ پھر آخر اب کون سی شرائط تھیں۔

"اسے سمجھائیں جہانگیر لالہ" پھپھو بلک رہی تھیں امی انہیں پانی پلا کر تھپکیاں دے رہی تھیں۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا وہ اس قدر خود سر ہو گی۔ اس نے شوہر کو بھی پیر کی جوتی سمجھ لیا ہے۔ بھلا زندگی اس طرح گزاری جاتی ہے۔ وہ آخر شوہر ہے اس کا۔ کہیں تو کسی بات پر تو روکے گا۔ کوئی بے جان جانور تو نہیں ہے۔" وہ بھائیوں کے سامنے دل کھول کر رو رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ طنین ابو کو بھی برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

عموجان نے انہیں تسلیاں دیں کہ وہ خود طنین ابو کو سمجھا کر سسرال بھیج دیں گے۔

دوسرے دن تینوں بھائی پھپھو کے گھر گئے تھے مگر ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ معاملہ کتنا سلجھا۔ یہ ہمارے علم میں نہ آ سکا۔ اور نہ میں اس روز کے بعد سے پھپھو کے گھر خود گئی تھی۔

جس روز میری شادی کی تاریخ رکھی گئی اس دن روشانے نے رابعہ اور مہرو کے ساتھ مل کر گھر میں خوب تیاریاں کیں۔ تینوں نے کچن ہی الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ لڑکے انہیں چھیڑ رہے تھے۔

"خوش تو تم ایسی ہو رہی ہو جیسے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے۔" سیف روشانے کی لمبی چوٹی کھینچتے ہوئے ہنسا۔

"اس کی خوشی میں مجھے یہ سارا کچھ کرنا پڑے گا" میں نے اس کے بنائے بڑا پر ہاتھ صاف کرنا چاہا کہ اس نے بیلن کھٹ سے میرے ہاتھ پر دے مارا۔

"یہ سارا کچھ ہی تمہارے لیے نہیں ہے باہر نکلو" اس نے مجھے ڈپٹ کر باہر نکال دیا۔ مہرو ٹیبل سجا رہی تھی تب۔ ابا گھر میں داخل ہوئے اور ایک روح فرسا دھماکا کیا جس نے پورے جلال ہاؤس کی دیواروں کو ہلا ڈالا۔

سلطانہ جہاں یعنی طنین ابو کی طلاق ہو گئی۔

روشانے کے ہاتھ سے بڑا کی ٹرے چھوٹ گئی۔

اور میں تو وہیں کھڑے کھڑے غش کھا کر گر پڑی۔

جب ہوش میں آئی تو پورا گھر افسردہ تھا عورتوں کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو ڈھلکے جا رہے تھے۔ میں بیڈ سے اٹھ بیٹھی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میری آواز پر سب گھبرا کر دوڑے چلے آئے۔

عموجان نے مجھے پیار سے سہلایا میں ان سے لپٹ گئی۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا عموجان!" مجھے لگ رہا تھا میرا دل پھٹ جائے گا۔ کیسے اتنی بڑی خبر پہ یقین کر لوں۔

ہنستی مسکراتی طنین ابو میری نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔

میں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ آنکھوں میں آنسو پھیلنے لگے۔

"میں جانتا ہوں اگر ایسا ہی ہوتا رہے تو خدا کی ذات کا احساس کیسے ہو گا بیٹا۔ وہ موجود ہے۔ ساری خدائی اس کے ہاتھ میں ہے ہمارے ٹوٹتے ارادے اور ناکامیاں اس کے طاقتور ہونے کی دلیل ہیں بیٹی۔"

عموجان نے مجھے یوں بانہوں میں بھر لیا جیسے [illegible] بہت چھوٹی سی بچی ہوں اور میں بھی ان کی [illegible] میں سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"تہنیت اور رنگ جمانے کی بے جا آزادیوں [illegible] یہ دن دکھاتے ہیں۔ آزادی کا احساس ایک سمندر [illegible] کے ساحل میں ہی عافیت ہے جبکہ ساحل کو چھوڑ کر [illegible] ناؤ کے تیرنے کی خواہش رکھنے والے ڈوب جاتے ہیں۔"

لیے ہر چیز کی حد مقرر کی ہے۔ حدود کو توڑنے والے تباہ ہوجاتے ہیں مگر سلطانہ یہ بات کبھی نہ سمجھ سکی نہ تبینت اسے سمجھا سکی۔"

عمو جان کے لہجے میں بھی دکھ بول رہا تھا۔

یہ غم کوئی ادنیٰ تو نہ تھا کہ بھلا دیا جاتا "جلال ہاؤس" میں اندوہ فضا رچ گئی تھی۔

لاکھ طینی الو کا قصور تھا سب یہی کہتے تھے۔ خود پھپھو بھی یہی کہتی تھیں کہ اس نے اپنا گھر اپنی ضد اور خودسری میں برباد کیا ہے۔

ابرار احمد جتنا بھی لبرل سوچ کا بندہ تھا مگر تھا تو ایک مرد کوئی روبوٹ تو نہیں بن سکتا تھا جس کا سارا کنٹرول طینی الو کے ہاتھ میں ہوتا۔

کچھ بھی تھا مگر میرا دل طینی الو کے حق میں تھا میرا رواں رواں ان کے دکھ پر آزردہ تھا۔

عمو جان جا کر زبردستی انہیں "جلال ہاؤس" لے کر آگئے۔ وہ ملیں اجاڑ اور ویران ہو رہی تھیں کہ سب ہی ان سے ہمدردی محسوس کرنے لگے۔ "جلال ہاؤس" کا ہر فرد ان کی دلجوئی میں مصروف رہتا۔

میں تو دن رات ان کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی۔ ان کو خوش کرنے کے جتن کرتی رہتی۔

"اگر تم سب لوگ نہ ہوتے تو میں مر جاتی دشی۔ یقین کرو "جلال ہاؤس" نے مجھے ذہنی مریض ہونے سے بچا لیا ہے۔" وہ لان میں گھاس پر میرے ساتھ بیٹھی ازحد ملول ہو کر کہہ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں "جلال ہاؤس" کے مکینوں کے لیے عقیدت بھی پیار تھا مگر لہجہ اتنا ٹوٹا ہوا تھا کہ میرا دل بھی بھر آگیا۔

"الو! آپ بھول جائیے سب کچھ کوئی ڈراؤنا خواب سمجھ کر۔"

"آہ ڈراؤنا خواب!"

"ہاں، ڈراؤنا خواب ہی سمجھیے اب آپ زندگی کو نئے سرے سے شروع کیجیے گا۔" میں نے ان کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"میں نے اپنی پانچ ماہ کی ازدواجی زندگی میں کچھ نہیں دیکھا۔ جتنا ان چار ماہ میں سیکھا ہے بہت سے پردے میری آنکھوں سے ہٹے ہیں دشی۔ عورت بھیڑ بکری نہیں ہے تو پرندہ بھی نہیں ہو سکتی کہ اڑتی پھرے۔ عورت کی بقا عورت ہونے اور رہنے میں ہے۔ اُس کی جائز حدود یہی ہیں پلوشہ جو شریعت نے دی ہیں۔ محبت کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ابرار نے مجھ سے بارہا اس جذبے کا تقاضا کیا۔ مجھے طعنے بھی دیے کہ میں ایک مادہ پرست، خود پرست اور تنگ صفت لڑکی ہوں۔ میں ابرار کو دوش نہیں دوں گی پلوشے۔ میں نے ہی اسے نہیں سمجھا۔ وہ میری اپنی خواہش تھا۔ ایک لبرل سوچ رکھنے والا آزاد اور ماڈرن گھرانے کا فرد۔ اور ایسے گھرانے کے مرد اپنے فیصلے یوں ہی کر ڈالتے ہیں۔ وہ زیادہ عرصے تک خود کو ٹینشن میں نہیں رکھتے۔ اُلجھی ڈور سلجھاتے نہیں کاٹ دیتے ہیں۔ اس نے بھی یہی کیا۔ مجھے وقت نہیں دیا سوچنے کا میری خودسری کا دریا اترتا تو شاید میں اپنی شکست مان لیتی۔ میرے اندر ٹھہراؤ آجاتا۔ مگر اس نے تو سرے سے یکدم ہی سائبان کھینچ لیا۔ مجھے بھری دھوپ میں چھوڑ دیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔ ان کے آنسو میرے دل پر انگاروں کی طرح چٹخنے لگے۔ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے دکھوں کو کیسے سمیٹوں۔ ان کی مسکراہٹوں کو واپس کیسے لاؤں۔

اس دن ہم زبردستی طینی الو کو باہر لے گئے۔ اتفاق سے سبریز خان بھی ساتھ تھے۔ دو گاڑیوں میں مل کر ہم سب جلو پارک آئے تھے۔ لڑکے فواروں کے پانی سے سب کو تنگ کر رہے تھے لڑکیاں ادھر ادھر بھاگ کر خود کو بچا رہی تھیں۔ میں نے ایک فوارہ کا منہ اٹھا کر ایمان کی طرف کر دیا۔ وہ پورا بھیگ گیا۔ لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں۔ پھر روشانے نے ایمان کے قریب آنے سے پہلے مجھے کھینچ کر تالاب کی طرف بنے خوشنما پتھروں پر کھینچ لیا۔

ہم سب ہنسنے لگے اسی دم میری نظر طینی الو کی طرف اُٹھی۔ سبریز خان کے پاس کھڑی تھیں۔ کچھ کہہ رہی تھیں۔ مجھے سنائی تو نہیں دے رہا تھا مگر ان دونوں کو اتنے قریب قریب کھڑے باتیں کرتے دیکھ کر میرے دل کو زبردست دھچکا لگا تھا۔

طینی الو کے لبوں پر یکدم مسکراہٹ کی کرن پھوٹی تھی۔ اور سبریز خان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کس لہر کی طرح آئی تھی۔

سیف نے فوارہ میری طرف کر کے نل کھول دیا۔ میں پورا بھیگ گئی مگر مجھ میں ہلنے کی سکت نہیں تھی۔ یونہی بے حس بیٹھی رہ گئی تھی۔

مجھے لگا جیسے میرے اندر کوئی زلزلہ سا آیا ہے اور میں اپنی بنیادوں تک سے ہل گئی ہوں۔

ہر طرف برسات سی ہو رہی تھی مگر مجھے ہر نظر سے دھواں ہی دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا۔

اچانک میں اپنی جگہ سے اٹھی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ میری ساری شوخی جیسے دم توڑ گئی۔ میں نے تولیے سے منہ پونچھتے سب سے رخ موڑ لیا۔

طلین اپو کی ہنسی میں بے حد کھنک تھی۔ اب ان دونوں کے آس پاس باقی سب بھی کھڑے ہنستے جانے کن باتوں پر ہنسی کے یہ طوفان امڈ رہے تھے۔ مگر ہنسی کی یہ جھنکار میری سماعت پر ہتھوڑے کی ضرب برسنے لگی۔

وہ سب ہنستے مسکراتے شور مچاتے واپس گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے میری غیر معمولی خاموشی محسوس ہی نہ کی۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔

حتیٰ کہ سبریز خان نے بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ (ہاں انہوں نے آج تک مجھے اہمیت ہی کب دی تھی۔ میں تو ان پر مسلط کر دی گئی تھی۔)

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی طلین اپو تیمل کو چڑا رہی تھیں اور ہنسی جا رہی تھیں۔ ان کی ہنسی سننے کے لیے تو میں تمنا کرتی رہی تھی اور اب جو ہنسی کی چاندنیاں ان کے چہرے پر چٹک رہی تھیں تو میرا دل جانے کیوں بکھر رہا تھا۔ سینے کی دیواروں پر اضطراب پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک بے نام خوف دل کی دیواروں پر جمتا جا رہا تھا۔

راستے میں سب نے آئسکریم کھائی۔ طلین اپو کے پسندیدہ فلیور کی۔ اور پیپرمنٹ سبریز خان نے کی۔ وہ بھی خاصے فریش دکھائی دے رہے تھے۔

"وشی! طلین اپو اب خاصی بہل گئی ہیں نا؟" رات روشانے میرے نزدیک بیٹھی بالوں میں برش چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"وقت بھی کتنا بڑا مرہم ہے۔" وہ بال سمیٹ کر کھڑی ہو کر اپنا ہیر بینڈ ڈھونڈنے لگی۔

دو وقت یا سبریز خان) میرے دل میں کرب آمیز احساس سمٹ آیا۔ میں نے آنکھیں میچ لیں۔

"ہاں خدا انہیں ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔ دکھ بھی تو اتنا بڑا ملا ہے انہیں۔ یہ کھیل تماشے عمر بھر کے سہارا تو نہیں بن سکتے۔" میرے لہجے میں ان کا درد سمٹ آیا۔

"ہاں وشی، یہ تو ہے۔ دل چاہتا ہے ان کے سارے دکھ ہم سمیٹ لیں۔ بہت ہی گھٹیا خاندان تھا ابرار احمد کا۔ انہوں نے اچھی اپو کی قدر نہیں کی۔ میرا دل چاہتا ہے۔ انہیں شوٹ کر دوں۔ جنہوں نے میری اپو کی زندگی میں آگ لگا دی۔"

وہ ابرار احمد کو باتیں سناتی طلین اپو کے غم میں کڑھتی ایک سوٹ اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئی۔

میں اپنی جگہ مضمحل سی بیٹھی رہ گئی۔ میرے دل میں اداسی اپنے پنکھ پھیلائے ہوئے تھی۔

"ان کے دکھ سمیٹے جا سکتے ہیں روشے۔" میں نے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

"ان کے دکھ دور ہو، مداوا، سبریز خان تمہارا لالہ بن سکتا ہے۔ بس اتنا ہی ہو گا نا کہ تمام تر تشنگیاں، ساری حسرتیں میری جھولی میں آ جائیں گی۔ تو ایسا کون سا انوکھا ہو گا۔ میں تو یوں بھی ناکام تشنہ ہوں۔ ایک میرا دامن خالی ہونے سے سبریز خان اور طلین اپو کی اذیت کا سفر تو تمام ہو گا!"

میرا ذہن کیا کیا سوچتا جا رہا تھا۔ اور دل تھا کہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ مگر میں نے اپنے تمام تر احساسات کی لو دھیمی کر لی تھی۔ اپنے جذبوں پر بند باندھ لیے تھے۔ یوں بھی سبریز خان کے ساتھ میں زندگی کی اس اذیت کا سفر مزید جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ میری انا اب کسی طرح کی مفاہمت پر آمادہ نہیں تھی۔

اس کی آنکھیں نہ تھیں سمندر تھا
ڈوب جانا میرا مقدر تھا ! !
سبب دل شکستگی مت پوچھ
سامنے آئینے کے پتھر تھا
جس کی سانسوں میں تھی مسیحائی
اس کا ایک ایک لفظ نشتر تھا
جس کو عابد سکونِ دل کہیے
اب نہیں ہے کبھی میسر تھا !

کھٹ کی آواز پر میں نے سر اٹھایا۔ بہروز خان ڈیک کا بٹن آف کر کے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو میں سٹپٹا گئی۔ میرا پہلا دھیان اپنے دوپٹے کی طرف گیا میں نے اسے جلدی سے شانے پر ڈالا اور ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بیڈ سے اتر گئی۔

"تم ان سب کے ساتھ نہیں گئیں؟" وہ بہت غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے، پتا نہیں میری حماقت کا یہ شو کتنی دیر سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں میرے سر میں درد تھا!" میں رُخ موڑ کر دھیرے سے بولی۔ سیف سب کو متعددہ ویلفیئر ہیلے میں لے گیا تھا۔ یہ پروگرام اس نے طلیق الرحمٰن کے لیے خصوصی طے کیا تھا میں سر درد کا بہانہ بنا کر نہیں گئی تھی۔

"آپ کیوں نہیں گئے۔ طلیق الرحمٰن تو گئی ہیں؟" میں بے اختیار کہہ گئی۔ پھر گھبرا کر ذرا سا چہرہ موڑ کر دیکھا مگر ان کا چہرہ ہر احساس سے عاری تھا۔

"ہاں۔ اچھی بات ہے۔ اس طرح وہ بہل جائے گی۔" ان کا لہجہ پُرسکون تھا۔ اور یہ سکون میرا سکون غارت کر گیا۔ کتنی فکر ہو گئی تھی انہیں طلیق الرحمٰن کی، کہاں ان کے گھر کے راستوں سے بھی نفرت تھی۔ اونہہ! محض ڈرامہ تھا وہ۔ انگور کھٹے تھے جب، بہرحال مجھے اب سب کچھ طلیق الرحمٰن کے لیے پسند تھا۔ انہیں طلیق الرحمٰن کی طرف ملتفت دیکھ کر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ بہل جائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کے تمام تر دکھوں کا مداوا ہو جائے۔ وہ عمر بھر کے لیے بہل جائیں۔"

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہیں سمجھے یا بن رہے تھے۔

میں نے ایک لمحے کو آنکھیں میچ لیں پھر کھول لیں۔

"آپ تو بہت سمجھدار ہیں کیا مجھے تفصیل سے کہنا پڑے گا؟" میرے لہجے میں ہلکی سی چبھن در آئی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ کھل کر کہو۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔" وہ برہمی سے بولے۔

"آپ طلیق الرحمٰن سے شادی کر لیں۔" میں اپنے اندر دکھ کی اٹھتی لہروں کو برداشت کرتے ہوئے بے حد اعتماد سے بول گئی، وہ ششدر رہ گئے۔

"وہ بہت دکھی ہیں اور یوں بھی آپ کی ہی کبھی یہ خواہش رہی تھی۔"

"پلیز شِر!" وہ سرخ چہرہ لیے میری طرف بڑھے میں پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھ بڑھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔

"میرے اور آپ کے درمیان ایسا کوئی دلی تعلق تو ہے نہیں جس کے ٹوٹنے کی فکر ہو۔ یوں بھی میں تو آپ پر مسلط کر دی گئی تھی۔ تائی اماں کی ہی خواہش رہی ہوگا۔ مجھے صرف نفرت کے سوا آپ سے کیا ملا ہے۔ سلطانہ جہاں کی محبت نے آپ کو آج تک جکڑ رکھا ہے۔ میں اتنی نادان اور کم فہم نہیں ہوں کہ کچھ نہ سمجھ سکوں۔ وہ آپ کی تقدیر ہیں بنا لیں انہیں زندگی۔ سارے زخم مندمل ہو جائیں گے ان کے۔ اور آپ کے بھی۔"

"خاموش ہو جاؤ۔ پلیز شِر!"

"چلائیں مت۔" میں ان کے آگے آنے پر پیچھے ہٹی۔ ان کے غصے نے مجھے قطعی متاثر نہیں کیا۔ "نہیں آؤں گی میں اب آپ کے کسی بھی رعب میں۔ میرے دامن میں آپ نے جتنی نفرت ڈالی ہے۔ اس سے زیادہ نفرت میں آپ سے کرتی ہوں۔ چلے جائیں یہاں سے۔ ہمارے درمیان یہ رشتہ آج سے ختم ہے۔ آپ آزاد ہیں۔ پلیز طلیق الرحمٰن سے شادی کر لیجیے۔ خدا کے لیے انہیں سمیٹ لیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے، وہ بہت دکھی ہیں۔ انہیں سزا مت دیجیے۔"

میں بولتے بولتے رک گئی، میرے اعصاب ٹھٹھر گئے۔ انہوں نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا کہ مجھے لگا میرے رخسار پر جلتی انگیٹھی رکھ دی گئی ہو۔ پھر پوری قوت سے میرا بازو پکڑا اور مجھے دیوار پر دھکیل دیا۔

"تمہیں میں نے ابھی اتنے اختیارات نہیں دیے کہ تم میری زندگی کا فیصلہ کرتی پھرو۔ مائنڈ یور اون بزنس!" دیوار پر ایک ہاتھ جما کر میرے چہرے پر جھک کر گویا بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑے۔

"اور میری زندگی کے فیصلے عمر بھر آپ کرتے رہے ہیں کیا حق پہنچتا تھا۔ جواب دیجیے میں کوئی روبوٹ تھی۔ کوئی بے جان کھلونا تھی۔ چلے جائیں ہٹ جائیں میری نظروں کے سامنے سے۔"

میں نے ان کے سینے پر اپنے ہاتھ رکھ کر انہیں زور سے دھکا دیا اور بھاگ کر باتھ روم میں جا کر بند

ہو گئی۔ یکدم کمرے میں شور سنائی دینے لگا۔

شاید یہ شور سن کر سب ادھر آگئے تھے مگر میں باہر نہیں نکلی، پھر رات تک کمرے میں بند رہی۔ خبر ہو گئی تھی کہ پورے گھر میں یہی بات موضوع بنی ہوئی ہے۔

روشانے میرے پاس آئی، اس کے چہرے پر بڑی نمایاں ناراضگی رقم تھی۔

"کیا سمجھ کر تم نے سبریز لالہ سے ایسی گھٹیا بکواس کی؟ وہ تو گویا تمہیں قتل کرنے کے درپے تھے" میں بیڈ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

"وشی۔ وشی۔ میں تم سے پوچھ رہی ہوں؟" اس نے میری چادر کھینچ لی۔

"مت کرو ڈرامے اپنے لالہ کی طرح۔ کیا تم آنکھ کان نہیں رکھتیں۔ کچھ محسوس نہیں کرتیں۔ کیا دیا ہے آج تک تمہارے لالہ نے مجھے۔ محبت کا ایک لفظ تک نہیں ملا روشانے رحم کرو تم سب مجھ پر۔ میں اس آزمائش کی اہل نہیں ہوں جس میں تم جان۔ الی، تم سب مجھے جھونکنا چاہتے ہو۔ اور پھر تم ہی تو کہتی ہو کہ تم طینی الپو کے غم سمیٹ لیں۔ بھلا ادیکھے سمیٹ سکتی ہوں میں؟" میں دوبارہ چادر تان کر لیٹ گئی۔ وہ ہکا بکا کتنی دیر بیڈ پر بیٹھی رہی مگر اس کے بعد کچھ بھی نہ بولی۔

مجھے لگ رہا تھا گھر میں ہر کوئی مجھ سے خفا ہے۔ یہاں تک کہ ممی جان کو بھی ایک چپ لگ گئی تھی۔ وہ آنکھ اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھتے تھے۔ نہ کوئی مجھ سے باز پرس کر رہا تھا نہ سوال۔

ع؎ پھر حریف بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تھی، مگر آتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے:
زگس تیری بے رخی نہ گئی
ہم تیری آرزو بھی کھو بیٹھے

میں لان میں آکر اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھ کر گھاس نوچنے لگی میرا دل بہت اداس تھا بے حد بے حساب۔ مگر کسی کی آنکھ میرے غم میں شریک نہیں تھی۔

میں نے بڑی بے دردی سے ٹہنی پر لہلہاتے گلاب کو نوچ لیا۔

"تم اس قدر گستاخ اور احمق ہو گی، مجھے اندازہ نہیں تھا۔" اچانک طینی الپو میرے سامنے دھپ سے بیٹھ گئیں، انہیں غیر متوقع دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ انہیں کیسے خبر ہو گئی تھی۔ یقیناً روشانے نے فون کیا ہو گا۔

میں دو سرے پل اپنی حیرانگی سمیٹ کر بے نیاز بن گئی، وہ مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔

"یہ تم نے سبریز کے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے؟" وہ پھنکاریں۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی؟"

"شٹ اپ یہ وہ دھاڑیں" یہ تم نے اس کی محبت کی ہی نہیں میری بھی انسلٹ کی ہے۔ اور ہماری دوستی کی بھی؟"

"ا دوستی؟" میرا دل چاہا میں زور زور سے قہقہے لگاؤں، میں نے سنبھل کر ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کے اور ان کے درمیان دوستی نہیں ہے بلکہ محبت کا دو رشتہ ہے۔"

"شٹ اپ۔ وشی شٹ اپ۔ تم۔ تم؟" انہوں نے بے حد سختی سے ہونٹ بھینچ کر مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"کیا سمجھ کر تم نے اتنی چیپ بات کہی؟" وہ پہلی بار مجھے اس طرح غصے میں دکھائی دیں ـــــ ان کی ناک کے کناروں پر سرخی پھیل گئی تھی میں نے سر جھکا لیا اور گھاس کے تنکے سے کھیلنے لگی پھر یکدم دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر زور زور سے رونے لگی۔

"آخر آپ سب لوگوں کو میرا ہی قصور کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ اس ظالم سفاک شخص سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟"

"وہ صرف تمہیں چاہتا ہے احمق صرف تمہیں" انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مت بہلائیے مجھے اس جھوٹ سے۔ ممو جان بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر سچ یہ نہیں ہے سچ یہ ہے کہ انہیں آپ سے محبت تھی ـــ ہے اور رہے گی میں تو ان کی زندگی میں جبراً داخل کر دی گئی ہوں۔ بس آپ ان سے شادی کر لیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے اور آپ کو بھی ان کی۔"

"یہ تم اتنی عاقل، بالغ، با اختیار کب سے ہو گئی ہو،

ادا تنے بڑے بڑے فیصلے کرتی پھرو۔ عمر کے ساتھ ساتھ عقل ابھی چھوٹی ہے۔ ابھی تمہاری۔" انہوں نے سخت ناراضگی سے مجھے دیکھا۔ میں بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

"بے وقوف لڑکی۔ اول تو سبریز اتنا سیدھا نہیں کہ جبری فیصلے برداشت کر لے۔ ہاں اس وقت وہ نانی جان کا حکم بجا لایا تھا۔ مگر وقت نے اسے تم سے بہت قریب کر دیا ہے محبت کا پودا اگتا تو خود بخود ہے مگر اسے پنپنے کے لیے سازگار حالات اور آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آب و ہوا وہ بہار تم تھیں۔ تم نے سبریز کی محبت کے پودے کو تناور درخت بنا دیا ہے۔ آج میں سچ کہہ رہی ہوں دشی۔ میری طرف دیکھو۔" انہوں نے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "یہ جو سنہری جھیلیں ہیں نا ان میں وہ پورے کا پورا ڈوبا ہوا ہے۔ یہ سنہری رنگ کم بخت ہوتا ہی متاثر کن ہے۔"

میں نے گھبرا کر ان کا ہاتھ ہٹانا چاہا تو انہوں نے میرے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

"پتا ہے کیا، وہ مجھ سے صرف اور صرف تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے معاف کر دیا ہے اور اب ہمارے درمیان دوستی کا پائیدار رشتہ ہے جسے تم داغدار کرنے چلی ہو۔ بہت ماروں گی تمہیں میں پلوشہ! وہ اتنا گرا ہوا انسان نہیں ہے کہ راستے بدلتا رہے۔ ہاں میں ناقدری تھی جو ہیرے کو نہ پہچان سکی۔ مگر تم تو مجھ جیسی مت بنو۔ اور سنو، وہ اب تمہیں بخشنے کا نہیں کہتا ہے اسے بھی شوٹ کر دوں گا اور خود کو بھی۔"

میرے بھل بھل بہتے آنسو رک گئے۔ میں تحیر آمیز بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ہاں دشی! ایسا کچھ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ اور نہ مجھے سبریز سے شادی کی خواہش ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو میں اپنی زندگی کو روگ نہیں لگاؤں گی۔ اب میں شادی کروں گی جہاں "جلال ہاؤس" والے کہیں گے جو رشتہ امی ابو پسند کریں گے۔ اور ماموں جان (ممو جان) بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ سبریز تمہیں اپنی کل متاع کہہ کر سنبھال کر رکھتا رہا ہے۔ اس نے تمہارے گرد یہ دائرہ نفرت میں نہیں محبت کی انتہا میں تنگ رکھا ہے۔ بعض اوقات انسان محبت میں خود غرض ہو جاتا ہے۔ اور یہ خود غرضی تو بالکل قابلِ معافی ہے۔"

~ دل کی باتیں [illegible]

تیرا شاعر [illegible]

وہ زور سے ہنس پڑیں اور [illegible] میں دیکھنے لگیں۔

"اس بے وقوف کو واقعی محبت کرنا نہیں آیا اور پھر تم جو اتنی بڑی قربانی دینے چلی تھیں۔ ذرا اپنی شکل دیکھی ہے۔ ایسا لگتا ہے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔" ان کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ میں نے کھسیا کر سر جھکا لیا۔

"اچھا چلو اٹھو، اندر چلو۔" وہ مجھے کھینچنے لگیں مگر میرے تو قدموں میں بالکل سکت نہیں تھی کہ اٹھ سکتی۔

پتا نہیں وہ سچ کہہ رہی تھیں یا بہلا رہی تھیں۔ یقین کرنے کو دل چاہ بھی رہا تھا اور یقین آ بھی نہیں رہا تھا۔ کھونا تو اب میں بھی کچھ نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بعد رہ ہی کیا جاتا میرے پاس۔

وہ چلی گئیں تو میں نے وہیں بنچ کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ سب کچھ تو اس شخص کی ذات سے منسوب تھا میرے لیے۔ میری ہنسی، میری خوشیاں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد یکدم مجھے اپنے کندھوں پر دباؤ محسوس ہوا۔ یہ دباؤ دو مردانہ ہاتھوں کا تھا۔ میں نے بے یقینی بیٹھے بیٹھے سر اٹھایا مگر دوسرے پل گھبرا کر جھکا دیا۔ وہ عین میرے پیچھے کھڑے تھے اور میرے شانوں پر ہاتھ رکھے جھکے ہوئے تھے۔ ان کی ہلکی سبز آنکھوں کے میرے اتنے قریب تھے کہ میرا دل سینے کی دیواروں سے دیوانے کی طرح ٹکرانے لگا۔

غزل
تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ ترکِ ربط پر کیا مجھ سے وحشی یاد آتے ہیں
تعلق توڑنا آساں تھا تو آنکھ کیوں نم ہے
انا پرور، جفا پیشہ بھی کیوں آنسو بہاتے ہیں

ان کی بھاری آواز نے میرے دل کی حالت ابتر کر ڈالی میں نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر ہاتھوں کے دباؤ نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی۔ وہ میرے سامنے آ گئے۔

"کیا اب بھی وضاحتوں کی ضرورت ہے؟" وہ میرے قریب بیٹھے تو میں گھبرا کر جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

"کیسے یقین کر لوں کہ یہی سچ ہے۔" میری آواز یکدم ہی آنسوؤں سے بھرا گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا راستہ روک کر بالکل میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"یہی سچ ہے پلوشہ۔ اور تمہیں یقین بھی کرنا ہوگا۔" وہ دو قدم چل کر میرے قریب آئے۔ "تمہیں تو میں اپنے وجود کا حصہ بنائے بیٹھا ہوں۔ تمہاری محبت کے احساس سے میرا دل لبریز ہے۔ پھر تمہیں یہ خیال کیونکر آیا کہ تم مجھ پر مسلط کی گئی ہو؟"

انہوں نے میرے بالوں کی جھالریں میرے چہرے سے ہٹاتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"آپ کے رویوں نے یہ احساس دلایا ہے۔ نفرت اور محبت رویوں سے پہچانی جاتی ہے۔"

"اور اگر سامنے والا ناسمجھ ہو پھر؟" ان کے ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ کی کرن پھوٹی۔ میں نے انگلیاں اضطرابی انداز میں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

"میں کوئی ناسمجھ نہیں ہوں۔" میرا انداز احتجاجی تھا۔

"اگر سمجھدار ہو تو ایسی احمقانہ حرکتیں کیوں کرتی پھر رہی ہو ادھر دیکھو بے وقوف۔" انہوں نے یکدم میرا سر پکڑ کر میرا رخ اپنی جانب کر لیا۔

"کچھ لوگوں کے نزدیک محبت گیت کی طرح ہوتی ہے، جسے وہ اظہار کے ساز پر بجاتے ہیں۔ میرے نزدیک محبت خوشبو کی مانند ہے، ایسی خوشبو جسے میں صرف اور صرف اپنے دل کے پھول میں بند رکھنا چاہتا تھا۔ ڈر لگتا تھا خوشبو کو پھیلنے دیا جائے تو یہ بہت دور نکل جاتی ہے۔ اور میں اب کچھ کھونا نہیں چاہتا... محبت نمائشی اور ریاکاری کی آرزو۔ تم استفسار تو... میں تمہارا دامن اس خوشبو سے بھر دیتا۔" میں... پلکیں اوپر اٹھائیں۔

"ہاں محبت سمندر ہے۔ اور اب میرے سامنے... ساحل نہیں نہ تمنا ہے، میں اس میں ڈوب چکا ہوں... اب ابھرنے کی کوئی خواہش بھی نہیں رہی۔" انہوں نے... تھکی تھکی سنہری آنکھوں میں اپنی سبز آنکھیں ڈال دیں... ایسا لگا جیسے شعاعِ مہر سے تمازت ٹکرا گئی ہو۔ مجھے ہر طرف بجلیوں کے کڑکے دکھائی دینے لگے۔ ان کے جملوں کی نغمگی نے میری رگوں میں گویا... کی لہریں بہا دیں۔ مجھے لگا ان کی محبت رواں دریا ہے جس کے بہاؤ میں میری ناؤ نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ ڈوب تو میں بھی گئی تھی ان سبز جھیلوں میں... ابھرنے کی متمنی بھی نہیں تھی۔

"خوبیاں خامیاں تو ہر بشر میں ہوتی ہیں نا... کیا تم مجھے میری خامیوں سمیت قبول نہیں کرو گی۔ مجھے فرشتہ ہونے کا دعوا نہیں ہے میں واقعی اب تک خودغرض بنا رہا، تمہارا دل توڑتا رہا۔ مگر مطمئن تھا ایک دن سارے گلے شکوے ساری رنجشیں سمیٹ لوں گا۔ محبت میں خوش گمانیاں تو رہتی ہیں نا۔ اور میں اس کا حسن ہیں۔ آئی لو یو دشی۔"

میں اچانک بالکل اسکول گرل کی طرح جھینپ گئی اور وہ بے ساختہ اپنی ہنسی کو نہ روک سکے تھے۔ کتنے گلے شکوے تھے جو میری روح پر شب... مجھے لگتا تھا یہ مجھے ایک دن ڈس لیں گے۔ مگر اب روح و دل اس ہلکی پھلکی بدلی کی طرح ہو گئے تھے جس میں ہمہ رنگ تابندگیاں جھلملانے لگی ہیں۔

غزل
اس کے لہجے کا اثر تو ہے بڑی بات قتیلؔ
وہ تو آنکھوں سے بھی کرتا ہوا جادو آئے

میں نے پلکیں جھکا دیں۔ میرے دل میں دھنک ہی دھنک پھیلنے لگی۔ ایسی دھنک جو کبھی نہ چھٹنے والی تھی۔